و طباعت معمولی صفحات ۲۴۴ مجلد مع گرد پوش قیمت دس روپیے ناشر کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ ۴۔

پروفیسر عبد المغنی نے وقتاً فوقتاً جو ادبی و تنقیدی مضامین مختلف رسالوں میں لکھے تھے ان کے بعض مجموعے پہلے چھپ چکے ہیں، زیر نظر مجموعہ ۲۱ مضامین پر مشتمل ہے اس میں صف اول کے علاوہ دوسرے اور تیسرے درجہ کے چند ادیبوں اور شاعروں کے خدمات شعر و ادب کے بعض پہلوؤں پر گفتگو کی گئی ہے، مصنف نے انیسؔ، غالبؔ، اقبالؔ، تلوک چند محروم، فراق، فیض، عبد العزیز خالد، مانوس سہسرامی، پرویز شاہدی کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے، اور اختر اورنیوی، علی عباس حسینی اور شکیلہ اختر اورنیوی مظفر پوری کی افسانہ نگاری، رشید احمد صدیقی کی تنقید نگاری اور ملا ابن العرب کی طنز نگاری کی خصوصیات دکھائی ہیں، اور ان کے ادبی درجہ و مرتبہ کو واضح کیا ہے، مختلف اصناف مثلاً "جدید اردو شاعری" "ڈراما اور تھیٹر"، اردو افسانہ نگاری اور اسلامی ادب پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے "جدید ادبی مسائل"، "جدید و قدیم کا فریب" اور "اسلامی ادب" خصوصیت سے قابل مطالعہ مضامین ہیں، ان سے مصنف کے ادبی نقطۂ نظر کا اندازہ ہوتا ہے، وہ "ترقی پسند ادب" اور "جدیدیت" کے بڑے ناقد ہیں، دونوں کی انتہا پسندی، خامی بلکہ گمراہی بھی دکھائی ہے اور اسلامی ادب کے گرویدہ ہیں، اس کی خوبیوں اور توازن کا ذکر کیا ہے، انھوں نے فراق کی شاعری کے بارہ میں مناسب خیالات ظاہر کئے ہیں، مصنف کے بعض خیالات اور تبصروں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کی ادبی و تنقیدی صلاحیت اچھی ہے، اور مجموعی حیثیت سے ان کے خیالات میں اعتدال و وزن ہے، اس لئے یہ مجموعہ مطالعہ کے لائق ہے،

"ض"

……ـــــــــــ……

جلد ۱۲۲ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۷۸ء عدد ۵

مضامین

شذرات

ہماری مرکزی حکومت کے ایک بہت ہی بااثر وزیر نے اردو کو ناگری رسم خط میں لکھنے کا مشورہ دیا ہے جس کے بعد ان کا خیال ہے کہ اردو کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا، اس سے پہلے بھی یہ آواز سنی گئی تھی، مگر وہ قابلِ اعتنا نہیں سمجھی گئی، اب پھر دہرائی جا رہی ہے،

کسی سیاسی رہنما کا مشورہ سیاسی مصلحتوں سے خالی نہیں ہوتا ہے، زبان و ادب کا معاملہ بھی سیاست کی نذر ہو رہا ہے، یہ نعرہ برابر جاری ہے کہ قومی دھارے کی یکسانیت کی خاطر ایک زبان کا ہونا ضروری ہے، ہندی زبان کا رواج ابھی پورے ملک میں قائم نہیں ہو رہا ہے، بعض علاقوں میں اس کی مخالفت بھی ہو رہی ہے، اس کے حامی اب ناگری رسم خط کا سہارا لینا چاہتے ہیں، اور یہ کہکر اس کے دائرہ کو وسیع کرنے کی کوشش میں ہیں کہ رسم خط مشترک ہو گیا تو ملک کے لسانی جھگڑے آسانی سے طے ہو جائیں گے، یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ دعویٰ کرے کہ اگر دنیا کے تمام لوگ ایک ہی قسم کا لباس پہننا شروع کر دیں تو سارے عالمی اختلافات ختم ہو جائیں گے، یورپ میں رسم خط اور لباس دونوں یکساں ہیں، مگر وہاں ہر قسم کی باہمی آویزش جاری ہے جس کی انتہا دو عالمگیر لڑائیوں میں دیکھی جا چکی ہے،

اردو ناگری لپی میں لکھی شروع ہو جائے گی، تو اردو پڑھنے والوں کی آیندہ نسلوں کے لئے اس کے گذشتہ لٹریچر کو دریا برد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا، کیونکہ اگر ہماری مرکزی حکومت کا کل سالانہ بجٹ اس کو ناگری رسم خط میں منتقل کرنے میں خرچ کر دیا جائے گا، تو بھی یہ ممکن نہ ہو سکے گا، اس طرح ناگری رسم خط کی خاطر اردو زبان کو اپنی ساری تہذیبی علمی اور ادبی وراثت سے منھ موڑنا ہوگا، علم ادب اور تہذیب کا بہت بڑا سرمایہ عربی اور فارسی کتابوں میں بھی ہے جو اردو رسم خط کے ذریعہ

سے پڑھ لی جاتی ہیں، وہ کیا ہوں گی، کس میوزیم میں رکھی جائیں گی، ؟

ناگری رسم خط میں اردو کو لکھنے کی تلقین کرنے والے، اردو زبان کے مزاج، اس کے حروف تہجی کی صوت، اس کے اعراب کی امتیازی خصوصیات، اس کے ساکن اور متحرک آواز کے طرز ادا، اس کے تلفظ کے حسن سے واقف نہیں، وہ اس کے الف ممدودہ، الف مقصورہ اور الف تنوین، تائے دراز تائے مدور، تائے موقوفہ، واؤ معروف، واؤ مجہول، واو عطف، واو معدولہ، ہائے ملفوظ، ہائے مخلوط ہائے مختفی، ہائے معروف، ہائے مجہول اور ہمزہ وغیرہ کی اہمیت کو کچھ نہیں سمجھتے، اگر سمجھتے تو پھر اردو کو ناگری رسم خط میں لکھنے کی نصیحت نہ کرتے، وہ بتائیں کہ ناگری میں اردو کے صحیح املا، اور ہیئت کے ساتھ اعلیٰ، ادنیٰ، دعویٰ، عیسیٰ، موسیٰ، علیٰ حالہٖ، یقیناً حکماً، فسلاً بعد نسلٍ، ذوالنون، ذوالفقار، البشر، کعبہ، شگفتہ، صلوٰۃ، زکوٰۃ، خواجہ، خویش، خبر، جنبش وغیرہ کو کیسے لکھا جا سکتا ہے، وہ ناگری لپی میں اثر اور عصر، نذر، اور نظر، آسی، اور عاصی، زہیر اور ظہیر، ذفر اور ظفر، حال، اور ہال، ہمراہ کو لکھ کر کوئی فرق پیدا نہیں کر سکتے، وہ غور کریں، کہ ژند، پاژند، ژالہ، اور ژولیدہ بیانی کو کیسے لکھ سکتے ہیں، پھر کسی زبان کی لطافت اور نزاکت کو قومی دھارے کے ایک بے جا تخیل کی بنا پر قربان کرنا کہاں تک صحیح ہے، ؟

ہندی میں ث، ذ، ژ، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، اور ق کے ساتھ کے الفاظ کا صحیح املا لکھا ہی نہیں جا سکتا ہے، اردو رسم خط کی خوبی یہ ہے کہ ہندی کیا اس کو عربی، فارسی، اور انگریزی حروف تہجی پر بھی برتری حاصل ہے، عربی اور فارسی میں ٹ، ڈ، اور ڑ نہیں، فارسی میں چ، ژ اور گ ہیں، تو عربی میں یہ حروف نہیں، عربی اور فارسی بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، ڈھ، اور ڑھ وغیرہ جیسی آوازوں سے بالکل آشنا نہیں، انگریزی خ، ط، ض، ع، اور ق وغیرہ سے بالکل مانوس نہیں، اردو میں ان تمام زبانوں کے حروف تہجی کی آواز سمائی

دے گی، اس میں ہر لفظ کا تلفظ پوری صحت کے ساتھ ادا ہو سکتا ہے،

ایک عرب مرچ کو مرش، چائے کو شائے، آگرہ کو اکرہ بول جائے گا، ایک ایرانی اردو کا لفظ ڈال بولنا چاہے گا، تو وہ دال کہہ سکے گا، انگریز اعظم گڈھ کو اعظم گرہ، علی گڈھ کو علی گڑھ، الٰہ آباد کو الہاباڈ، دہلی کو ڈلہی بولتا ہے، ہندی بولنے والے ابو الفضل کو ابو پھل، عاشق کو آسک، معشوق کو ماسوک، عشق کو اِسک، زُلف کو جُلپھ، فریاد کو پھریاد، اور انصاف کو انساپھ بولنے یا لکھنے میں جھجک یا غلطی محسوس نہ کریں گے اردو بولنے والے کو ان تمام الفاظ کو صحیح مخرج کے ساتھ ادا کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا، ناگری رسم خط میں اضافت کا بھی اہتمام نہیں، ہماری شاعری اگر ناگری رسم خط میں اضافت کے بغیر لکھی گئی، تو اس کی ساری لطافت جاتی رہے گی،

.....٭.....

اورنگ زیب عالمگیر پر یہ الزام رکھا جاتا ہے کہ وہ ہندوؤں کے جذبات کا لحاظ نہیں رکھتا تھا، اردو کے رسم خط سے اردو بولنے والوں کو جو جذباتی لگاؤ ہے، اس سے وہ محروم کر دئے گئے تو کیا کوئی مورخ یہ لکھنے کا حق نہیں رکھ سکتا ہے، کہ اس دور کے اورنگ زیب نے وہی سب کچھ کیا، جس کے لئے گذشتہ تاریخ کے اورنگ زیب کو مجرم ٹھہرایا جاتا ہے مسلمان حکمرانوں پر یہ بھی الزام ہے کہ وہ بے جا طور پر غیر مسلموں سے جزیہ لیا کرتے تھے، موجودہ دور میں جزیہ لینے اور ادا کرنے کی صورتیں بدلی ہوئی ہیں، برسر اقتدار جماعت کی خاطر زبان قربان کر دی جائے، ضمیر کو گروی رکھ دیا جائے، ایمان کو نیلام گھر کے حوالہ کر دیا جائے، اور کردار کو دوسروں کے ہاتھوں کھلونا بننے دیا جائے، تو یہی اس دور کا قابلِ قبول جزیہ ہے، مگر صاف ذہن رکھنے والے محبانِ وطن کو یہ سوچنا ہے کہ یہ جزیہ لینا اور دینا کہاں تک ملک کے لئے مفید ہے،

.....٭.....

مقالات

عہد نبوی میں نظامِ حکومت

کے

مظاہر اور خصائص

سیرۃ النبی جلد ہفتم کے ایک باب کے کچھ اوراق، سلسلہ کے لئے دیکھئے معارف ماہ اپریل ۱۹۸۸ء

از

مولانا سید سلیمان ندوی

یہ واقعات ایک دنیوی اور ایک اخلاقی سلطنت میں نمایاں حد فاصل قائم کرتے ہیں، دنیوی سلطنتوں میں مجرم اس لئے جرم سے انکار کرتے ہیں کہ ان کو سزا سے نجات مل جائے گی، لیکن ماعز رضی اللہ عنہ اور دوسروں نے اس بنا پر جرم کا اعتراف کیا کہ دنیاوی سزا کے اجراء سے وہ آخرت کے عذاب سے بچ جائیں گے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء و استغفار سے ان کا گناہ معاف ہو جائے گا، دنیوی سلطنتوں میں جلاد اس بنا پر سزا دیتا ہے کہ وہ اس خدمت پر مامور ہے، لیکن صحابہ نے ماعز پر اس لئے پتھر برسائے تھے کہ انھوں نے حکم الہی کی بے محابا تنفید کی توفیق پائی، دنیوی سلطنتوں میں مجرم کا بھاگ نکلنے کی کوشش کرنا ایک دوسرا جرم ہے لیکن اسلام کے نظام سلطنت میں وہ توبہ کا ذریعہ ہو سکتا ہے،

اخلاقی اور دنیوی سلطنتوں کے طرز عمل میں اس موقع پر نمایاں امتیاز قائم ہوجاتا ہے جہاں کوئی مجرم خود سلطنت کے صدمہ پہونچانے کے لئے کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے، ایک رحمدل دنیوی سلطنت خراج کو معاف کرسکتی ہے، بڑے بڑے جرم سے درگذر کرسکتی ہے، رعایا کے ساتھ نہایت رفق و لاطفت کا برتاؤ کرسکتی ہے، لیکن وہ کسی بدخواہ سلطنت کے معمولی سے معمولی جرم سے اغماض نہیں کرسکتی، لیکن عہد نبوت میں بعض مسلمانوں نے بعض ایسے کام کئے جن سے بظاہر امور جنگی و سیاسی کو نقصان پہونچ سکتا تھا، مگر چونکہ اون کی نیت صاف تھی اور دل پاک تھے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس جرم سے صرف اس بنا پر چشم پوشی فرمائی ہے کہ انھوں نے اسلام کی کوئی ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی تھی جس سے ان کے ایمان کی سچائی پوری ظاہر ہوچکی تھی، حاطب ابن بلتعہ ایک صحابی تھے انھوں نے کفار قریش کے پاس ایک خط لکھا جس میں ان کو مسلمانوں کے مخفی حالات کی خبر دی، یہ خط پکڑا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ اوس نے خدا، خدا کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ حاطب نے کہا کہ خدا کی قسم میرے ایمان میں کوئی خلل نہیں آیا ہے، خط لکھنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ جو مہاجرین مکہ میں اپنے آل و اولاد کو چھوڑ کر چلے آئے ہیں ان کا خاندان وہاں موجود ہے اور وہ ان کی حفاظت کرتا ہے، لیکن میرے بال بچوں کا کوئی سہارا نہیں تھا، اس لئے میں نے چاہا کفار پر ایک احسان کردوں جس کے ذریعہ سے میرے بال بچوں کی حفاظت ہوجائے، آپ نے فرمایا سچ کہتا ہے، ان کی نسبت صرف اچھے کلمات استعمال کرو، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر کہا کہ اس نے خدا، خدا کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجئے کہ اس کی گردن اڑا دوں لیکن آپ نے

فرمایا کیا وہ اہل بدر سے نہیں ہے؟ کچھ تو ہے، جس کی بنا پر خدا نے اہل بدر کے متعلق یہ فرمایا ہے،

اِعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ وَجَبَتْ لَکُمُ الْجَنَّةُ، — جو چاہو کرو کیونکہ جنت تمہاری قسمت میں لکھی جاچکی۔

یہ سنکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور کہا کہ خدا کے رسول کو سب سے زیادہ علم ہے۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب بن بلتعہ کے معاملہ میں جو طرز عمل اختیار فرمایا وہ صرف شرکت بدر کی فضیلت ہی پر مبنی نہ تھا، بلکہ ایک ایسے اصول پر مبنی تھا جسکو دنیوی اور اخلاقی سلطنتوں کے درمیان ایک حد فاصل قرار دیا جاسکتا ہے سیاست کا ایک لازمی جزو بدگمانی ہے، اور اسی بنا پر وہ بادشاہ سب سے زیادہ مدبر اور دوراندیش خیال کیا جاتا ہے، جو سلطنت کے راز کو اپنے عزیز و اقارب تک سے چھپائے لیکن یہ اصول صرف دنیوی سلطنتوں کی سیاسیات کا جزو ہے، اور اسی وجہ سے ان سلطنتوں میں حاکم و محکوم میں اتحاد اور خلوص کا رابطہ نہیں پیدا ہوتا، لیکن اخلاقی اور مذہبی سلطنتوں کا تمامتر دارومدار اخلاص باللہ اور خلوص باہمی کے اعتماد پر ہے، اور اسی اعتماد کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب بن بلتعہ کے جرم سے چشم پوشی کی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی اصول کو ان مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے،

حسن الظن من حسن العبادة[2] — حسن ظن، ایک قسم کی عبادت ہے، (ابوداؤد کتاب الادب ص ۱۹۸)

---

[1] بخاری جلد ۲ کتاب المغازی ص ۵۶۷،

اور قرآن مجید نے اس کو اور واضح کر دیا ہے،

ان بعض الظن اثم — بعض گمان گناہ ہوتے ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاسی اصول کے طور پر اس کی تعلیم دی ہے،

ان الامیر اذا ابتغی الریبۃ فی الناس افسدھم — جو امیر لوگوں کے ساتھ بدگمانی کی جستجو کریگا وہ ان کو برباد کر دیگا،

اور عمال سلطنت کو اس اصول پر عمل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے،

عن معاویۃ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول انک ان اتبعت عورات الناس افسدتھم او کدت ان تفسدھم — حضرت معاویہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم لوگوں کے جرائم کی ٹوہ میں رہے تو تم نے یا تو ان کو برباد کر دیا، یا عنقریب برباد کر دوگے

چنانچہ جب تک حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور قائم رہا، تمام معاملات میں اسی اصول پر عمل ہوتا رہا حضرت عبداللہ ابن مسعود کے سامنے ایک شرابی پیش کیا گیا، اور اس کی نسبت کہا گیا کہ اس کی داڑھی سے شراب ٹپکتی ہے "لیکن چونکہ انھوں نے خود اسکو شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس لئے فرمایا کہ ہمکو ٹوہ لگانے کی ممانعت کی گئی ہے، البتہ جو جرم ہمکو علانیہ نظر آتا ہے اس پر مواخذہ کرتے ہیں:

دخین حضرت عقبہ ابن عامر صحابی کے منشی تھے، انھوں نے ان سے شکایت کی کہ ہمارے ہمسایہ شراب پیتے ہیں، میں نے ان کو منع کیا وہ لوگ باز نہیں آئے، اب ان کے لئے پولیس کو بلاتا ہوں حضرت عقبہ نے فرمایا کہ "درگذر کرو" دخین نے دوبارہ کہا کہ اب وہ لوگ شراب کا

انکار کرتے ہیں، میں پولیس کو بلاتا ہوں" حضرت عقبہ نے پھر فرمایا کہ درگذر کرو کیونکہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ۱۔

من رای عورۃ فسترھا کان کمن احیی موؤدۃ [1] — جس نے کسی برائی کو دیکھکر چھپالیا، اس کا درجہ اس شخص کے برابر ہے جس نے ان لڑکیوں کو موت سے بچالیا جو زندہ درگور کر دی گئی تھیں

اخلاقی حیثیت سے اس اصول کی خوبی میں کسی شخص کو کلام نہیں ہو سکتا، لیکن ہمکو صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے، بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ سیاسی حیثیت سے سلطنت پر اس اصول کا کیا اثر پڑ سکتا ہے، ابن خلدون نے اس پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے، جس کا عنوان یہ ہے کہ تلوار کی دھار کا تیز کرنا سلطنت کے لئے مضر ہے، اور اس کو اکثر برباد کر دیتا ہے اس مضمون میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ تمامتر اسی سیاسی اصول کی شرح ہے جس کا اشارہ قول نبوی میں ملتا ہے، اس لئے ہم اس موقع پر اس اصول کی سیاسی حیثیت کے نمایاں کرنے کے لیے اس مضمون کا خلاصہ نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں،

"جاننا چاہئے کہ رعایا کی مصلحت کا تعلق سلطان کی ذات، جسم، حسن، ڈیل ڈول وسعت علم، حسن خط، اور ذہانت کے ساتھ نہیں ہوتا، ان کی مصلحت کا تعلق صرف اس نسبت کے ساتھ ہے جو ان کو سلطان کی ذات کے ساتھ ہوتا ہے، اس لئے ملک اور سلطنت ایک اضافی چیز ہے، اور دو شخصوں کے درمیان ایک قسم کا تعلق ہے سلطان کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ رعایا کا سردار اور ان کا سرپرست اور نگران ہے اس لئے سلطان وہ ہے جس کے پاس رعایا ہو، اور رعایا وہ ہے جس کا کوئی سلطان ہو

---

[1] یہ تمام حدیثیں ابوداؤد کتاب الادب ص ۱۹۰ باب فی النہی عن التجسس میں ہیں،

اور اس نسبت سے جو صفت مستنبط ہوتی ہے اسی کا نام بادشاہی ہے، پس جب یہ صفت اور اس کے لوازم ٹھیک ہوتے ہیں تو سلطان کا مقصد کامل طور پر حاصل ہوتا ہے، اگر وہ عمدہ ہے تو وہی رعایا کی عین مصلحت ہو، اور اگر وہ بری اور ظالمانہ ہے تو وہ ان کے لیے مضر اور ان کی ہلاکت کا سبب ہے، سلطنت کی خوبیوں کا تمام تر دار و مدار نرمی پر ہے، کیونکہ سلطان اگر ظالم ہو، سخت گیر ہو، لوگوں کے معائب کی کرید کرے، ان کے جرائم کو ایک ایک کر کے گنے تو رعایا پر خوف و ذلت طاری ہوجاتی ہے، اور لوگ جھوٹ اور مکر و فریب کے دامن میں اس سے پناہ حاصل کر لیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ تمام چیزیں ان کا اخلاق بن جاتے ہیں اور ان کا اصلی ضمیر اور نظام اخلاق برباد ہوجاتا ہے، اور اکثر وہ جنگ کے موقعوں میں اس سے پہلو تہی کرتے ہیں، اور بسا اوقات ان کے قتل پر آمادہ ہوجاتے ہیں، اور اس سے خود سلطنت برباد ہوجاتی ہے، اور اگر اس قسم کے سلاطین کی ظالمانہ حکومت ہمیشہ قائم رہ جائے تو جذبۂ محبت بالکل مٹ جاتا ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا، لیکن اگر سلطان رعایا کے ساتھ نرمی کرے، ان کے گناہوں سے درگذر کرے تو وہ اس کے پہلو میں سمٹ جاتے ہیں اس کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، اس کی محبت میں شرابور ہوجاتے ہیں، اور اس کے دشمنوں کے مقابل میں جان دیدیتے ہیں، اس کے ہر پہلو سے سلطنت کا نظام ٹھیک ہوجاتا ہے سلطنت کی خوبیوں کی اصل حقیقت یہی ہے، لیکن اس کے لوازم و توابع میں بھی چند چیزیں ہیں، مثلاً ان پر احسان کرنا اور ان کے معاش کا خیال رکھنا بھی ایک قسم کی نرمی ہے، اور رعایا کی محبت حاصل کرنے کا سب سے بڑا اصول یہ ہے، جاننا چاہیے کہ جو لوگ بیدار مغز اور تیز فہم ہوتے ہیں ان میں نرمی بہت کم پائی جاتی ہے، نرمی اکثر سیدھے سادھے اور بھولے بھالے لوگوں میں پائی جاتی ہی، بیدار مغز لوگوں کی نگاہ چونکہ دور رس ہوتی ہے اور وہ ابتدا ہی سے

انجام کار کو پیش نظر رکھتے ہیں، اس لئے لوگوں کو تکلیف مالا یطاق دیتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ تباہ ہوجاتے ہیں، اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کمزور لوگوں کی روش اختیار کرو، اور اسی وجہ سے شارع نے حاکم کے لیے یہ شرط قرار دی ہے کہ وہ بہت چالاک نہ ہو، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب زیاد ابن سفیان کو معزول کیا تو انھوں نے کہا کیا میں اس منصب کے فرائض کو انجام نہیں دے سکتا، یا میں نے کوئی خیانت کی ہے حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ یہ کچھ نہیں، میں نے تمکو صرف اس بنا پر معزول کیا ہے کہ میں رعایا پر تمھارے عقل کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔

ابن خلدون نے ان سطروں میں جو آئین جہانبانی پیش کیا ہے، اس پر اگرچہ دنیوی سلطنتوں میں بھی عمل کیا جاسکتا ہے لیکن اس طرز عمل کا جو دوسرا پہلو ہے یعنی یہ کہ اس نرمی کے برتاؤ سے رعایا میں خیرہ سری، جرائم سے بے پروائی، اور احکام سلطنت کے عدم تعمیل کا خیال نہ پیدا ہوجائے اور ضعیف سلطنتوں کی نرمی سے یہ باتیں سلطنتوں میں پیدا ہوتی ہیں، مگر اسلام نے جس تخیل پر اپنی سلطنت کی بنیاد کھڑی کی ہے وہ سراسر مذہبی ہے، اس میں امیر کے احکام کی اطاعت خدا کی خوشنودی کا باعث اور اس کا انکار آخرت کا گناہ بتایا گیا ہے اسکا نتیجہ یہ ہے کہ نرمی یعنی جہاں تک ممکن ہو قانون شریعت کے اس پہلو سے کام لیا جائے، جس سے لوگوں میں امن و اطمینان پیدا ہو، جرائم کی تحقیق میں شہادت کا اصول اونچا ہو، عدل میں صداقت کی خلاف ورزی نہ ہو، امیر و غریب اور اونچ اور نیچ قانون کی نظر میں برابر ہوں، مجرموں کو اسوقت تک سزا نہ دی جائے جب تک شہادت اپنے پورے شرائط کے ساتھ ثابت نہ ہوجائے اشتباہات جرم میں شکوک و شبہات کے موقع پر مجرم سے حدود کو ساقط کیا جائے اور قساوت اور سنگدلی کی ان تمام سزاؤں کو جو ظالم و جابر بادشاہوں نے جاری کر رکھی تھیں

ان کو یک قلم منسوخ کر دیا جائے، چنانچہ فرمایا،

ان اللہ یعذب الذین یعذبون　　　بے شبہہ خدا اون لوگون کو عذاب دیگا

فی الدنیا،　　　جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں،

صحابہ کے آخر دور میں جب خلافت نے سلطنت کے قالب میں ظہور کیا، اور ظلم وستم کی ہنگامہ آرائیاں شروع ہوئیں تو جن بزرگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض صحبت اوٹھایا تھا، انھوں نے اسی حدیث کے ذریعہ سے عمال کی دست درازیون کو روکنا چاہا، ایک بار حضرت ہشام بن حکیم بن حزام کا گذر شام مین ہوا تو دیکھا کہ چند نبطی دھوپ میں کھڑے کیئے گئے ہیں، انھوں نے اس کی وجہ پوچھی لوگوں نے کہا کہ جزیہ کے بارہ میں ان کو یہ سزا دیگئی ہے، انھوں نے کہا میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ خدا ان لوگون کو عذاب دیگا جو لوگون کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں،[1]

دنیوی سلطنتیں لطف ومحبت کا برتاؤ زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے ساتھ کر سکتی ہیں، غیر قوموں کے ساتھ ایک مہذب سے مہذب سلطنت کا برتاؤ بھی کچھ نہ کچھ ظالمانہ ہوتا ہے، لیکن ہشام بن حکیم بن حزام نے اس حدیث کو جس موقع پر بیان کیا وہ موقع تھا، جہان غیر قومون پر ظلم کیا جارہا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا نظام سلطنت کسی خارجی اثر سے اس اصول پر قائم نہیں ہوا تھا، بلکہ لطف ومحبت اس کی حقیقت کا لازمی جزء تھا، اور اس لئے یہ ابر کرم ہر قوم کے سر پر محیط تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد عمال کی نسبت تھا، لیکن معاملات خلافت میں خود آپ کا طرز عمل اس قدر فیاضانہ اور آسان تھا کہ لوگ آپ کی خدمت مین جرائم کا اعتراف اس بنا پر کرتے تھے کہ آپ اس میں کوئی تخفیف یا آسانی پیدا

[1] مسلم جلد ۲ ص ۳۰۹ کتاب الادب۔

کر دین گے، مسلمان تو مسلمان غیر قومون کو بھی آنحضرت صلعم کے اس فیاضانہ طرز عمل کا اعتراف تھا، چنانچہ یہودیوں میں دو مرد وعورت نے زنا کیا، تو تمام یہودیوں نے بالاتفاق کہا کہ ہم کو آنحضرت صلعم کی خدمت میں ان کو لے چلنا چاہیے، کیونکہ وہی ایک ایسے پیغمبر ہیں جو تخفیف کو لیکر مبعوث ہوئے ہیں،[1]

ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں سزا کا مستحق ہوں، مجھ پر حد جاری فرمایئے! آپ نے پوچھا کیا وضو کر کے چلے تھے، اوس نے کہا ہاں، آپ نے دریافت فرمایا، کیا ہمارے ساتھ نماز پڑھی تھی، اوس نے کہا ہان، آپ نے فرمایا جاؤ خدا نے تم کو معاف کر دیا،[2]

لوگون کے حوائج اور ضروریات کا اس قدر خیال فرماتے تھے کہ ایک لونڈی بھی جہان چاہتی آپ کو اپنے کام کے لیے ہاتھ پکڑ کر لیجاتی، ایک بار ایک مخبوط الحواس عورت آئی اور کہا کہ مجھے آپ سے ایک ضرورت ہے، آپ نے فرمایا تم اپنے کام کے لیے مدینہ کی جس گلی میں لے چلو مین چلنے کو تیار ہوں، چنانچہ آپ اس کے ساتھ گئے، اور اوس کے کام کو انجام دیدیا،[3] عدی بن حاتم جو مذہباً نصرانی اور طے کے رئیس تھے، اور بڑے بڑے درباروں میں رہ چکے تھے جب وہ حاضر خدمت ہوئے تو اون کو شک تھا کہ آیا حضور بادشاہ ہیں یا نبی ہیں، لیکن جب اون کی نگاہ کے سامنے سے یہ منظر گذرا تو کہہ اٹھے کہ حضور بادشاہ نہیں، کیونکہ یہ حسن خلق تو نبی ہی میں پایا جا سکتا ہے، اور اس کے بعد فوراً آپ کی نبوت پر ایمان لے آئے، متعدد واقعات اوپر ایسے گذر چکے ہیں کہ دیہات کے اعرابی آپ کی خدمت اقدس میں آتے تھے، اور نہایت بے تکلفی بلکہ بیباکی کے ساتھ سوال وجواب کرتے تھے، اور حضور اون کے ساتھ رفق وملاطفت کا برتاؤ کرتے تھے،

[1] ابو داؤد جلد ۲ ص ۲۲۹، کتاب الحدود [2] ابو داؤد جلد ۲ ص ۲۴۲ کتاب الحدود، وجہ قصور اوس کا جو تھا وہ حد کے قابل نہیں تھا، اس لیے بحکم ان الحسنات یذھبن السیآت اس قصور کی معافی کی خوشخبری دی گئی۔ [3] مسلم ج ۲ صفحہ ۲۹۳

ایک بدو نے ایک دفعہ آپ کی چادر پکڑ کر کھینچی تو آپ اوس کی طرف دیکھکر ہنس پڑے، اور اوس کو عطیہ دیا،[۱] بعض لوگوں سے اس قسم کے گناہ ہوجاتے تھے جن کے لئے اون کو مالی کفارہ ادا کرنا ضروری ہوتا تھا، لیکن اون میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو اپنے افلاس اور تنگدستی کے سبب خود کوئی مالی کفارہ ادا نہیں کر سکتے تھے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت المال سے ادا فرما دیتے تھے، ایک صحابی نے اس ڈر سے کہ روزوں میں اون سے کوئی بے عنوانی نہ ہوجائے، اوس سے بچنے کی یہ تدبیر کی کہ انھون نے اپنی بیوی سے رمضان میں ظہار کر لیا،[۲] لیکن آخر ایک رات کو بے قابو ہوکر بیوی سے مباشرت کر لی، صبح کو گھبرا کر انھون نے اپنے لوگون سے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے چلو، سب نے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو خود تنہا آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر جرم کا اعتراف کیا، آپ نے دو بار فرمایا کیا تم نے ایسا کیا، انھوں نے دونوں دفعہ جواب میں عرض کی ہان ہان، یا رسول اللہ مجھ ہی سے یہ حرکت ہوئی، اور اب خدا کا جو حکم ہو اوس کو صبر کے ساتھ انگیز کرنے کو تیار ہون، تو اللہ تعالے نے آپ کو جو کہا ہے آپ حکم فرمائیں، فرمایا ایک غلام آزاد کردو، انھون نے اپنی گردن پر ہاتھ مارکر کہا کہ یا رسول اللہ اس گردن کے سوا تو میرے قبضہ میں کوئی غلام نہیں، آپ نے فرمایا کہ مستقل دو مہینے کے روزے رکھو، عرض کی یا رسول اللہ جو پیش آیا وہ تو روزہ ہی کا نتیجہ ہے، آپنے فرمایا کہ تو پھر ساٹھ[۳] مسکینون کو ایک وسق کھجور دو، عرض کی یا رسول اللہ ہم نے تو خود رات فاقہ سے بسر کی ہے، آپنے اون کی یہ بات سنکر ارشاد فرمایا کہ صدقۂ بنو زریق کے عامل کے پاس جاؤ وہ تمکو اس قدر کھجور دیدیگا کہ اوس میں ساٹھ فقیروں کو بھی کھلاؤ اور جو بچ رہے وہ اپنے بال بچون کو کھلاؤ، وہ پلٹے تو لوگون سے کہا کہ میں نے

---

[۱] بخاری جلد ۲ ص ۹۰۰ [۲] ظہار کے معنی یہ ہین کہ بیوی کو محرمات شرعی سے تشبیہ دیدی جائے جیسے کوئی یہ کہے آج سے تو میری ماں کے برابر ہو اس صورت میں کفارہ لازم آتا ہے [۳] اس زمانہ مین رمضان مین رات کو مباشرت کی اجازت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا

تمہارے یہاں تنگی و بدتدبیری، اور رسول اللہ کے یہاں وسعت اور مشورہ نیک پایا،[۱]

مسلمانون کی طرف سے اخلاص وعقیدت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شفقت اور لطف وکرم اس دوگونہ جذبہ نے رعایا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قدر شیفتگی پیدا کردی تھی جس کی جھلک سلاطین دنیوی کے تاجہائے مرصع میں نظر نہیں آسکتی عرب کے بدوون کی مطلق العنانی، خودسری اور سرکشی کی جو داستانین عام طور پر بیان کی جاتی ہیں اور جن کی بنا پر خیال کیا جاتا ہے کہ اون کی وجہ سے نہ عرب مین کوئی نظام سلطنت کبھی قائم ہوا ہے، اور نہ ہوسکتا تھا، لیکن جب اسلام کا نظام سلطنت قائم ہوا اور اسلامی احکام نافذ کئے گئے تو ان خودسر بدؤن نے ان احکام کو کس سادگی مگر جوش عقیدت کے ساتھ قبول کیا، اوس کا اندازہ اون واقعات سے ہوسکتا ہے، جو عہد نبوت مین اون سے پیش آتے رہے تھے، ایک دفعہ ایک بدو نجد سے چلکر مدینہ آیا سفر سے پریشان اور بال الجھے ہوئے اور اسی حالت میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا، اور شریعت کے احکام پوچھے فرمایا دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں، عرض کی کہ کچھ اور نمازیں بھی، فرمایا نہیں، لیکن یہ کہ نفل پڑھو، پھر فرمایا اور رمضان کے روزے، سوال کیا کہ کچھ اور روزے بھی فرمایا نہیں، لیکن یہ کہ نفل رکھو، پھر زکوٰۃ کو ذکر فرمایا، اوس نے پھر پوچھا کہ اس کے سوا بھی کچھ صدقہ فرمایا نہیں مگر یہ کہ تم خود اپنی مرضی سے دو، اتنا سوال وجواب کرکے یہ کہتا ہوا چلا خدا کی قسم میں اس میں کمی بیشی نہ کرونگا، یہ سنکر حضورؐ نے فرمایا یہ شخص کامیاب ہوگیا، اگر سچا نکلا (بخاری کتاب الایمان)

ایک اور واقعہ ہے کہ صحابہ مجلس میں حاضر تھے کہ ایک بدو نے آکر کہا آپ کا قاصد

---

[۱] ابوداؤد جلد ۱ ص ۲۲۰ کتاب الطلاق،

ہمارے پاس آیا اور اوس نے ہم سے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ آپ خدا کے رسول ہیں اور آپ کو خدا نے بھیجا ہے، ارشاد ہوا اوس نے سچ کہا، اوس نے کہا آسمان کو کس نے پیدا کیا، فرمایا اللہ تعالےٰ نے۔ اوس نے کہا زمین اور پہاڑ کس نے بنائے، فرمایا اللہ تعالیٰ نے، اوس نے پھر کہا ان میں ہمارے فائدہ کی چیزیں کس نے بنائی ہیں فرمایا اللہ عزوجل نے، اوس نے کہا اوس خدا کی قسم جس نے آسمان کو پیدا کیا اور زمین کو بنایا، اور پہاڑ کو کھڑا کیا، اور انہیں فائدے رکھے کیا سچ مچ اللہ ہی نے آپؐ کو بھیجا ہے، فرمایا ہاں، اوس نے پھر عرض کی کہ آپ کے قاصد کا بیان تھا کہ ہم پر پانچ وقتون کی نمازیں ہیں، اور ہمارے مال میں زکوٰۃ ہے، فرمایا اوس نے سچ کہا، قسم ہے اوس ذات کی جس نے آپؐ کو بھیجا، کیا خدا نے آپؐ کو یہ حکم دیا ہے، فرمایا بے شک، پھر کہا آپؐ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ بھی ہے، فرمایا ہاں، سچ کہا۔ اوس نے کہا قسم ہے اوس کی جس نے آپ کو رسول بنایا، کیا خدا نے آپؐ کو اس کا حکم دیا ہے، فرمایا ہاں، پھر کہا آپؐ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ قدرت ہو تو خانۂ کعبہ کا حج کریں، فرمایا ہاں سچ کہا، عرض کی اوس کی قسم جس نے آپ کو بھیجا کیا خدا نے اس کا حکم دیا فرمایا ہاں، اوس نے عرض کی قسم ہے اسکی جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں ان احکام کی تعمیل میں کچھ گھٹا بڑھا نہیں کرونگا ارشاد ہوا اگر یہ سچ کہتا ہے تو یہ جنت میں داخل ہوگا، (بخاری)

ایک اور مجلس مین صحابہ حاضر خدمت تھے اور حضور ٹیک لگائے تشریف فرما تھے، کہ اتنے میں ایک شتر سوار آیا اور اوسی طرح مسجد میں داخل ہوا، پھر اونٹ سے اترا اور مسجد ہی مین اونٹ کو باندھ دیا، پھر مجمع کے پاس آکر پوچھنے لگا تم میں محمدؐ کون ہیں، لوگوں نے کہا کہ وہ گورے آدمی جو ٹیک لگائے ہیں، اوس نے کہا کہ اے عبد المطلب کے بیٹے، حضور نے فرمایا

ہاں کہو، اوس نے کہا کہ میں تم سے کچھ پوچھونگا، اور سختی سے پوچھونگا تو تم رنجیدہ نہ ہونا، فرمایا جو چاہو پوچھو، اوس نے کہا مین تمھارے پروردگار اور تم سے پہلوں کے پروردگار کا واسطہ دیکر پوچھتا ہون کہ کیا تم کو اللہ نے سب لوگون کے پاس رسول بناکر بھیجا ہے فرمایا خدایا ہان پھر کہا خدا کی قسم دیکر پوچھتا ہون کہ کیا خدا ہی نے آپ کو حکم دیا ہے کہ پانچ وقتون کی نماز پڑھیں فرمایا خدایا ہان، پھر کہا خدا کی قسم دیکر پوچھتا ہون کہ کیا اللہ ہی نے کہا ہے کہ سال مین ایک مہینے کا روزہ رکھین، فرمایا خدایا ہان، پھر کہا خدا ہی کی قسم دیکر پوچھتا ہون کہ کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے دولت مندون سے زکوٰۃ لیں اور ہمارے محتاجون کو بانٹ دیں فرمایا خدایا ہان، اوس نے کہا مین ایمان لاتا ہون اوس پر جس کو لیکر آپ آئے ہین، اپنے پیچھے والون کا نائب ہوکر آیا ہوں میں ضمام بن ثعلبہ ہون، (بخاری کتاب الایمان)

ذرا اس سادگی، بے تکلفی اور یقین کی دولت کی اس فراوانی کا منظر دیکھئے اور شیفتگی کا ایک واقعہ سنئے،

جبریہ واقعات تو ان بدوؤں کے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آئے صحابہ کرام جن کا شرف یہ تھا کہ وہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار تھے، وہ بھی اگر اون کی طرف سے گذر گئے تو اون کے ساتھ بھی اسی محبت کا ثبوت دیا، براء بن عازبؓ ایک صحابی تھے، اون کا اونٹ ایک دفعہ کھو گیا تھا وہ اسی کو ڈھونڈھنے نکلے تو بدوؤں میں پہونچ گئے، اون کو جب معلوم ہوا کہ یہ کون ہیں تو حضورؐ کے تعلق سے وہ اون پر گھوم گھوم کر نثار ہونے لگے، (ابو داؤد کتاب الحدود، ج ۲ ص ۱۴۹)

رعایا کی وفاداری، خلوص، جوش عقیدت کا سب سے بڑا امتحان گاہ میدان جنگ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا حصہ میدان جہاد ہی مین بسر ہوا ہے، لیکن صحابہ نے جس جوش کے ساتھ آپ کی حفاظت کی ہے، اور جس خلوص کے ساتھ آپ پر جانین نثار کی ہیں اسکی

نظیر روم و ایران کی تاریخ میں نہیں مل سکتی، چنانچہ صلح حدیبیہ کے متعلق جب کفار قریش کے نمائندہ عروہ ابن مسعود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو شروع کی تو ایک صحابی مغیرہ بن شعبہؓ آپ کی پشت پر مسلح کھڑے ہوئے تھے، عروہ گفتگو کرتے تھے تو عرب کے طریقہ کے موافق آپ کی داڑھی پکڑ لیتے تھے، لیکن جب جب اون کا ہاتھ آپ کی ریش مبارک کی طرف بڑھتا تھا مغیرہ تلوار کے قبضہ سے اوس پر ٹھوکر مار کر کہتے تھے، کہ آپ کی ریش مبارک سے ہاتھ کو الگ رکھو، عروہ نے اس جوش عقیدت سے متاثر ہو کر دوسرے صحابہ کی طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ آپ کا لعاب دہن بھی گرتا ہے تو لوگ تبرکاً اوس کو ہاتھ میں لیکر اپنے جسم اور چہرہ پر ملتے ہیں جب آپ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اوس کے بجالانے کے لئے سبقت کرتا ہے، جب آپ وضو کرتے ہیں تو لوگ وضو کے پانی کو تبرکاً پینے کے لیے ٹوٹتے ہیں، جب آپ گفتگو فرماتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے، لوگ ادب اور تعظیم سے آپ کی طرف نگاہ جما کر نہیں دیکھ سکتے وہ اس منظر جاہ و جلال کو دیکھکر پلٹے تو اپنی قوم سے کہا کہ میں تمام بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہو چکا ہوں، میں قیصر کسری اور نجاشی کے دربار میں گیا ہوں، لیکن میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اوس کے اصحاب اوس کی اس قدر عزت کرتے ہیں، جس قدر محمدؐ کے اصحاب محمدؐ کی تعظیم کرتے ہیں، جب وہ تھوکتے ہیں تو لوگ اوس کو ہاتھ میں لیکر اپنے جسم اور چہرہ پر ملتے ہیں جب آپ اونکو کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اوس کے بجالانے کے لئے پیش دستی کرتا ہے، جب آپ وضو کرتے ہیں تو ہر شخص وضو کے پانی کے لئے لڑتا ہے، جب آپ کلام کرتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے لوگ تعظیماً آپ کی طرف نگاہ جما کر دیکھ نہیں سکتے۔[1]

غزوۂ بدر کے متعلق جب آپ نے انصار سے مشورہ کیا تو اس موقع پر حضرت

[1] بخاری جلد ۱ ص ۳۸۰ کتاب الشروط

سعد بن عبادہ کی زبان سے جو فقرے نکلے وہ ہمہ تن جوش، خلوص، عقیدت، محبت اور وفاداری کے جذبات سے لبریز تھے، اونہوں نے کہا،

ایانا تريد يا رسول الله	یارسول اللہ کیا آپ کا اشارہ ہماری
والذی نفسی بیدہ لو	طرف ہے اوس ذات کی قسم جس کے
امرتنا ان نخیضها البحر لاخضناها	ہاتھ میں میری جان ہے اگر آپ کا حکم ہو
ولو امرتنا ان نضرب اکبادها	کہ ہم اس سمندر میں اپنے گھوڑے
الی برک الغماد لفعلنا،	ڈالدیں تو ہم ڈال دیں گے اور اگر حکم
(مسلم کتاب الجہاد باب غزوہ بدر)	ہو کہ ہم اپنی سواریوں سے برک الغماد[1]
	پر دھاوا کریں گے تو ہم کر دیں گے،

غزوۂ احد میں جب آپ نے کفار کی جمعیت کو گردن بڑھا کر دیکھنا چاہا تو حضرت ابو طلحہؓ نے جن الفاظ کے ذریعہ سے آپؐ کو روکا جوش محبت کی تعبیر اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے، انہوں نے کہا،

بابی انت وامی لاتشرف	میرے باپ ماں آپ پر قربان، آپ
یصبك سهم من سهام	گردن بڑھا کر نہ دیکھئے، کہیں آپ کو
القوم نحری دون نحرك	کوئی تیر نہ لگ جائے، میرا سینہ آپ کے
(بخاری کتاب المغازی غزوۂ احد)	سینہ کے سامنے ہے،

خیر یہ تو صحابہ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کے واقعات تھے، حضرت کے صحبت یافتہ غیر قوموں میں بھی پہنچ گئے، تو اون کی محبوبیت کا یہی عالم تھا، چنانچہ غیر قوموں

[1] یمن کی سمت میں ایک مقام کا نام،

کو بھی جب عمال نبوی کی سادگی اور انصاف پسندی کا منظر نظر آتا تھا، تو وہ بھی اون کی گرویدہ ہوجاتی تھیں، فتح خیبر کے بعد وہاں کی پیداوار کی تقسیم کے لیے آپ نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو مقرر فرمایا وہ وہاں گئے اور تخمینہ کرکے ہر کھجور کے درخت سے ایک خاص مقدار وصول کرنا چاہی، اس پر یہودیوں نے کہا "یہ تو بہت ہے" انھوں نے کہا اچھا میں تخمینہ کردیتا ہوں، تم لوگ اسکا نصف لے لینا، اس انصاف شعاری سے یہود اس قدر متاثر ہوئے کہ سب کے سب یکزبان ہوکر پکار اٹھے:

ھذا الحق بہ تقوم السماء	انصاف اس کا نام ہے اور اسی انصاف سے
والارض قد رضینا ان	آسمان و زمین قائم ہیں، جو کچھ تم نے کہا
ناخذ بالذی قلت[1]	ہم اوس کے قبول کرنے پر راضی ہیں،

فتوح البلدان بلاذری میں ہے کہ یہودیوں نے اون کو رشوت دینا چاہی لیکن انھوں نے کہا اے دشمنان خدا! تم مجھکو حرام کھلانا چاہتے ہو، خدا کی قسم میں ایک ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں جو میرے نزدیک محبوب ترین خلائق ہے، اور تمکو میں بندروں اور سوروں سے بھی زیادہ مبغوض رکھتا ہوں لیکن تمھاری دشمنی اور اوس کی محبت مجھکو عدل و انصاف کی راہ سے نہیں ہٹا سکتی، یہ سنکر تمام یہودیوں نے کہا کہ آسمان و زمین اسی انصاف سے قائم ہیں۔[2]

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ ص ۔ د کتاب البیوع، [2] فتوح البلدان بلاذری مطبوعہ یورپ ص ۲۱

اقبالؒ کے مداح اور نقاد

از، جناب صوفی نذیر احمد صاحب کاشمیری

محترم جناب صوفی نذیر احمد کاشمیری صاحب کا یہ مقالہ اس وقت آیا جب میں ایک لمبے سفر پر تھا، میری ڈاک میں غلطی سے رہ گیا، اسی لئے معارف میں اس کی اشاعت میں تاخیر ہوئی، جس کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے، اس مقالہ میں فاضل مقالہ نگار کا لب و لہجہ ان کا اپنا ہے، جو معارف کے روایتی لب و لہجہ سے مختلف ہے، مگر انکے احترام میں اس میں تبدیلی نہیں کی گئی ہے، غالب کے متعلق انھوں نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، اس سے معارف کو پورا اتفاق نہیں، مگر غالب کی مدح کے ساتھ ان کی قدح بھی بہت کی گئی ہے، اس مقالہ میں ان کی قدح کا ایک نمونہ اور بھی سامنے آئیگا،

"ض ع"

اخبار ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۱۱ر جون ۲۰۰۸ء میں ایک مضمون نگار نے اقبال پر ایک تنقیدی جائزہ شائع کیا ہے، اسی سلسلہ میں یہ سطور لکھی جارہی ہیں، راقم اس بحث میں ایک بڑی انسانی خدمت کے پیش نظر حصہ لے رہا ہے، آج عالم گیر انسانی معاشرہ تاریخ کے ایک ایسے مرحلے پر آچکا ہے کہ وہ صرف خود شناس، آدم شناس اور خدا شناس معاشرہ کی حیثیت سے ہی زندہ رہ سکتا ہے، فرد کو معاشرے کی فلاح و بقا اور معاشرے کو

فرد کی بقا و فلاح کا خیال رکھتے ہوئے اپنے فکر و عمل کو باہم مربوط کرنا ہوگا، اُسے جو کرنا ہوگا وہ بحیثیت انسان کرتا ہوگا، اس کا مرنا جینا انسانی فلاح کے نصب العین سے ہمہ جہتی طور پر مربوط رہنے سے ہوگا، اور اگر معاشرے کے خودسر اور خودغرض لوگ اس پر آمادہ نہ ہوئے تو پھر انسان بھی تاریخ حیات کا ایک بھولا بسرا خواب ہو سکتا ہے، خودسری، خودپسندی خودنمائی و خودغرضی کا نتیجہ اس کے سوا ہو ہی نہیں سکتا یہ خودسری خودپسندی خودنمائی و خودغرضی اگر حیوانی انواع کی بقا کی بنیاد ہیں تو یہی خواص انسانی ہلاکت و بربادی کا پیش خیمہ ہیں، انسان حیوانی خواص کو دبا کر اپنے مخصوص اخلاقی شعور کے سہارے ہی جی سکتا ہے، اور آج علم برائے علم، فن برائے فن، حکمت برائے حکمت و شعر برائے شعر، کے تمام تفرقہ پرواز بت خانوں کو مسمار کر کے ان سب کے ملبے سے ایک ایسی عبدگاہ کی تعمیر کرنا لازمی ہو گیا ہے، جہاں پوری نوع انسانی اپنے انفرادی و طبقاتی و معنوی امتیازات کو ختم کرتی ہوئی ایک ہی صف میں کھڑی ہو نہ کوئی محمود ہو، نہ کوئی ایاز ہو اور نہ کوئی بندہ، اور نہ کوئی بندہ نواز ہو، اگر کسی فرد کا عمل اس انسانی افادیت سے خالی ہے تو پھر اسے انسان کہلانے کا حق نہیں پہنچتا اور جب وہ انسان کہلانے کا حقدار نہیں تو پھر اسے قدرتاً تمام ان حقوق سے محروم ہو جانا چاہیئے، جو اسے بحیثیت انسان حاصل ہیں اور اسے حیوانات کے اس گلے میں شامل ہو جانا چاہیئے، جو اس کے ذوق کے مطابق ہو موجودہ دور کے ایک اہم مفکر (رسل) نے خوشی پر فتح حاصل کرنے کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے، مفکر موصوف نے کتاب کے پہلے باب کا آغاز ہی "اے کاش میں حیوان ہوتا" کے ایک فقرے سے کیا ہے، انسان اگر انسانی حیثیت اور اس کے شعور ذات کو دبا کر زندگی گزارنا چاہے تو پھر اسے قطعاً وہی موقف اختیار کرنا ہوگا جو رسل نے حصول خوشی کے لیے تجویز کیا ہے، اس کی ایک عالمگیر مثال تو ہپی ازم ہے اور دوسری مثال

مکمل ازم ہے، اور اپنے انسانی مقام کو کھو کر آج عالم انسانی اسی حیوانی کشمکش کا دنگل بن چکا ہے، جو اسے یقیناً یا تو ایک کھلے تصادم کے ذریعہ کائنات سے نیست و نابود کر دیگا یا پھر انسان کے اخلاقی شعور ذات اور اس کے طریق عمل کی نفی کر دیگا، اور برٹینڈ رسل کا حیوان بنا کر پھر جنگلوں کی طرف دھکیل دے گا، اس لئے ان ائمہ ضلالت کے یہاں انسانی خوشی یہی ہے کہ انسان شعور نیک و بد سے آزادی حاصل کرتا ہوا حیوانی بے فکرے پن کی دنیا میں چلا جائے موجودہ مغربی تہذیب نے انسانی کنبے کو اسی خطرناک موقف میں لا کھڑا کیا ہے، اور چونکہ یہ تہذیب ایک استثنائی رنگ میں عالمگیر ہو چکی ہے، لہٰذا اس کا انسانی بدل بھی قطعاً عالمگیر ہو سکتا ہے اور ایسی انسانی تہذیب کے لئے یہ بات اشد درجہ ضروری ہے کہ پوری نوع انسانی کے فکر و عمل میں نہایت درجہ یکسانی و ہم آہنگی ہو اور اس ہم آہنگی و یکسانی کو پیدا کرنے کے لیے سائنس برائے سائنس علم برائے علم، فن برائے فن، ادب برائے ادب کی ساری خودسریوں کو ختم کرتے ہوئے علم برائے انسان، حکمت برائے انسان، فن برائے انسان، ادب برائے انسان و شعر برائے انسان کے دور کا پوری ذمہ داری سے آغاز کرنا ہوگا، ایک ہموار، ہم آہنگ اور اخلاقی احساس ذمہ داری پر مبنی تہذیب ہی موجودہ عالم انسانی کو پرامن و بے خطر کرتے ہوئے، اس اخوت بھائی چارے کو پیدا کر سکتی ہے، جو طبقاتی تقابل و تحاسد و تنافر کے بجائے باہمی خیر اندیشی اور تعاون پر مبنی ہو،

شاعر اقبال

اقبال اسی دور کا وہ شاعر ہے جس نے اپنے قول و فعل اور فکر و عمل کو انسانی معاشرہ کی افادیت کا پابند رکھا ہے، وہ اپنے اظہار و تعبیر میں اگر محض شاعر ہے تو اپنے فکری مواد کے اعتبار سے ایک ہمدرد دل رکھنے والا انسان ہے، انفرادیت پسند اور غیر ذمہ داری کے بجائے وہ معاشرے کے دکھ درد اور بھلائی پر نظر رکھتا ہوا شاعری کرتا ہے، صرف یہی بات ہے جس کے

سبب راقم اقبال کے متعلق بدظنی دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

فلسفۂ خودی اقبال کے افکار میں خودی کا فلسفہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے، ٹائمس آف انڈیا کے مضمون نگار اس کی طرف ایک ہلکا سا طنزیہ اشارہ کر گئے ہیں، مذہبی حیثیت سے اقبال کے فلسفۂ خودی پر تنقید کی کافی گنجائش ہے مگر اقبال کے فلسفۂ خودی کا ایک ایسا مفید پہلو بھی ہے، جس پر اقبال کے نقادوں کے ساتھ ہی اس کے مداحوں کی بھی نظر نہیں ہے، حالانکہ فلسفۂ خودی کا یہی پہلو ہے، جس نے اقبال کو اسے اپنا موضوع فکر بنانے پر مجبور کر دیا تھا، اور جس کے واضح ہو جانے کے بعد اکثر وہ اعتراضات غیر متعلق ہو جاتے ہیں، جو اقبال پر کئے گئے ہیں،

یہاں اقبال کا ایک فارسی شعر نقل کرتے ہوئے اس کی حقیقت عرض کی جاتی ہے

خودی را پردہ می گوئی، بگو، من با تو ایں گویم
مزن کیں پردہ را چاکے کہ داماں نگہ تنگ است

ترجمہ۔ "تو خودی کو پردہ بتاتا ہے تو بتا، مگر میں تجھ سے یہ کہتا ہوں کہ اس پردہ کو چاک نہ کر، ورنہ پھر نظر کہیں ٹھہرے گی نہیں" حقیقت یہ ہے کہ جب انسان اپنی انفرادیت کو مرکز بنا کر سوچ بچار کا آغاز کرتا ہے، تو اسے کچھ متعین حقائق کا پتہ چل جاتا ہے، چاہے وہ از حد محدود ہی کیوں نہ ہوں مثلاً جب وہ یوں سوچتا ہے کہ میں کیا ہوں، کہاں کھڑا ہوں، میری منزلِ مقصود کہاں ہے، وہاں پہونچنے کے لئے مجھے کون سا راستہ اور کیا ذرائع اختیار کرنے چاہئیں، تو چاہے یہ سوالات اس کے دائرۂ فکر و عمل کو محدود کر دیتے ہیں لیکن پھر بھی ان سوالات کی کھوج لگاتے ہوئے انسان کو جو حاصل ہوتا ہے وہ ایک طرف واقعات کے کوچے کی چیز ہے محض تخیلات و اوہام کا سلسلہ نہیں ہے۔ اور دوسری طرف انسان کی اپنی زندگی کے لئے ان کی افادیت بھی قطعی ہے اور چونکہ یہ سارے سوالات تمام انسانوں کے لئے مرکزی حیثیت رکھتے ہیں لہذا ان کے جوابات

کی افادیت بھی سب کے لیے یکساں ہے، وہ پورے نوع انسان کو ایک دائرۂ فکر و عمل میں لانے والی ہے، لہذا انسان اپنی سوچ بچار کے نتیجے میں اپنے علاوہ تمام نوع انسانی کی تقدیر و تدبیر کے متعلق بھی بہت سے ضروری و مفید حقائق کو حاصل کر لیتا ہے، لیکن جب انسان اپنی انفرادیت اور خودی کو نظر انداز کرتے ہوئے سوچ بچار شروع کرتا ہے تو وہ پہلے قدم پر ہی لاادریت Agnosticism کا شکار بن جاتا ہے، اور اس کے سارے ادراکات و انکشافات ایک انتشار انگیز ہیجان کے علاوہ کچھ نہیں ہوتے اور ان کی قدر و قیمت صرف اتنی ہوتی ہے کہ "جو مانے اس کا بھی بھلا اور جو نہ مانے اسکا بھی بھلا ہو" اور یہ فلسفہ انسان کی راہ فلاح کو تاریک کرنے کا خطرناک فلسفہ ہے، وہ یقین اور قطعیت کا دشمن ہے، اس لئے کہ اگر انسان زندگی کے مختصر وقفے کو محض امکانات کے تجربے میں صرف کر دے تو وہ اپنے قوائے حیات اور صلاحیتوں کو انتشار کے سپرد کرنے کے سوائے کہیں نہیں پہونچتا، یہی اس کی ہلاکت ابدی ہے، تاریخ کے ان سارے باطنیون کے افکار کی یہی حیثیت ہے، جنھوں نے اپنے خاص مقام انسانی اور اپنی انفرادیت کا انکار کرتے ہوئے سوچ بچار کا آغاز کیا ہے، وہ اپنے ان بے سرو پا افکار کو روحانیت کا نام دیتے ہیں حالانکہ ان افکار کا سرے سے انسان سے ہی کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے کہ ان کی انسانیت تو اسی وقت رخصت ہو گئی تھی، جب انھوں نے اپنی انفرادیت کا انکار کر دیا تھا باطنیہ کا یہ گروہ عمران انسانی کا وہ مخالف گروہ ہے، جس نے آج تک انسانوں کو کوئی پائیدار تہذیب تعمیر کرنے سے محروم کر رکھا ہے، اور اب حالات ایسے پیدا ہو چکے ہیں کہ نوع انسانی کو اپنے فکر و عمل کو انسانی حیثیت کا پابند کرتے ہوئے اپنا لائحہ عمل متعین کرنا ہوگا،

انسانیت کا شاعر اقبال انسان کی انسانیت کا شاعر ہے، اور تاریخ پر بھی عالمانہ نگاہ

رکھتا ہے، لہذا اس نے اس باطنیہ منفی انداز فکر کے مقابل اپنی شاعری کی بنیاد انسانی انفرادیت کے استقلال اور خودی پر رکھی ہے، جو بہت بڑی خدمت انسانی ہے، چونکہ اقبال کے عام مداحوں اور نقادوں کی طرح ٹائمس آف انڈیا کے مضمون نگار کی نگاہ بھی انسانی خودی کے اس مفہوم پر نہیں ہے، لہذا انھیں اس پر اعتراض ہے،

البتہ جب اقبال اس خودی کا رخ خالقِ کائنات کی طرف کرتا ہوا خود کو اس کی رضا جوئی کا پابند کرنے کے بجائے اسے اپنی رضا جوئی کا مشورہ دیتا ہے تو وہ اپنے تسلیم کردہ معیار اسلام سے گر جاتا ہے، اس لئے کہ مذہب نے خالق کے مقابل تسلیم و رضا اور خود سپردگی کو ہی مخلوق کا ترقیِ حیات و فلاح بتایا ہے، اور امر واقعہ بھی یہ ہے، کہ خالق کائنات نے ہر چیز کو پیدا کرتے ہوئے اس کی تربیت و تکمیل کے لئے جو مختلف قوانین بنائے ہیں۔ مخلوق کی فلاح صرف اس میں ہے کہ اپنی فلاح و بقا کے ان قوانین مقدس کے سامنے تسلیم و رضا بن جائے لہذا خالق کے معین کردہ قوانین کا اتباع ہی انسان کو اپنے خالق کی طرف عروج و معراج دیتا ہے، یہاں اپنی پست خواہشات کی طرف اللہ پاک کو نزول کا مشورہ دینا شاعرانہ لاابالی پن ہے، مگر اس ظاہری گستاخی سے بھی اقبال ایک بڑے خطرے کا توڑ کر رہا ہے خطرہ یہ ہے کہ قلت ہوش اور کثرت جوش سے انسان باطنیہ کی طرح خالق و مخلوق کی دوئی کو اڑا کر "من تو شدم تو من شدی" کا مہلک راگ نہ شروع کر دے، اور تمیز مفید و مضر اور شعور خبیث و طیب دولت بے بہا سے انسان کو خالی کر دے، اور اپنے انفرادی استقلال کے احساس سے بےگانہ کرتا ہوا اسے پھر غیر انسانی کائنات میں لے نہ جائے انسان چاہے کائنات کی کلیت کے مقابل اپنی انفرادیت سے دستبردار ہو کر اس کی کلی ہم آہنگی کا دم چھلہ بن جائے، یا خالق کائنات کے مقابل اپنی ہستی سے دست بردار ہو کر نعرۂ اناالحق

بلند کر دے، یہ دونوں باتیں انسان کی اپنی مخصوص تدبیر و تقدیر کے لیے مساوی معرفت رکھتی ہیں، دونوں صورتوں میں انسان اپنے نظم و نسق کو برباد کرتا ہوا غایت جہل کو غایت معرفت قرار دے دیتا ہے، اور اس طرح اس جہل مرکب کا ارتکاب کرتا ہے، کہ جس کا کوئی علاج نہیں ہے، اقبال کے سامنے انسانی انفرادیت (خودی) کے یہ دونوں پہلو موجود رہتے ہیں اور وہ نہ صرف کائنات کی ناقابل ادراک وسعتوں کے مقابل بلکہ خود خالق کائنات کے مقابل بھی انسانی استقلال کی حفاظت کرتا ہے، اور یہ انسانی عمران کی بنیاد ہے، اقبال ایک طرف انسان و کائنات کی دوئی کو اور دوسری طرف انسان و خالق کائنات کی دوئی کو قائم رکھتا ہوا اس نورانی جزیرہ کی حفاظت کا سامان کرتا ہے، جسے کائناتِ انسانی کہا جاتا ہے، اور جو ساری کائنات کے درمیان اور خالق کائنات کے درمیان ایک برزخ ہے، کائنات کے سارے مصالح اور حکمتوں کا ظہور اسی نورانی جزیرے کے ذریعہ ہوتا ہے، انسان کے علاوہ کائنات تو ایک ہیبت انگیز صحرائے مرگ دیاس کے سوا کچھ محسوس نہیں ہوتی، مگر انسان کے اپنے مقام شرافت پر متمکن ہو جانے کے بعد یہ سب صحرائے مرگ دیاس ایک کارخانۂ حکمت و تدبیر بن جاتا ہے، انسان کائنات کے مصالح و حکم کی ایک مختصر سی لوح محفوظ ہے، اس لوح محفوظ کو انسانی بےتمیزی سے بچانا مصلحین انسانیت کا مشترکہ فرض رہا ہے، اور شاعری کے دائرہ میں اقبال نے اس حفاظت کا پورا حق ادا کیا ہے، اقبال، رومی کو اپنا مرشد قرار دیتا ہے، اور اس کی دائمی بےخودی پر اسے عمر بھر رشک آتا رہتا ہے؛

"خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں، میرے مولا مجھے صاحب جنوں کر!"

مگر اللہ پاک نے انکی اس دعا کو رد کرتے ہوئے اس سے شاعری کے دائرہ میں

ناموس انسانی کی حفاظت کا کام لیا ہے جو بہت بڑا اعزاز ہے، اقبال کے پیر صاحب کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا، رومی کی طرح استغراق و بے خودی کی اقبالی تمنا ایک باطل تمنا تھی، اس لئے کہ انسان تو غائت تمیز مفید و مضر اور نہایت شعور نیک و بد سے بنا ہے، اور یہ غائت ہوش و تمیز کا مقام ہے، نہ کہ بے خودی و بے ہوشی کا حیوانی بے فکرا پن ہے، راقم کئی سال تک اس بے خودی کا شکار رہنے کے بعد ہوش و تمیز کی دنیا میں آیا ہے، اور خوب جانتا ہے کہ صاحب ہوش و خرد ہونا کتنی بڑی انسانی سعادت ہے اگر چہ وہ غایت درجہ کا دردِ سر اور دردِ جگر بھی ہے، مگر اس کے سوائے وہ اخلاقی شخصیت تعمیر نہیں ہوسکتی، جو لاہی بقا میں جاتی ہے، اور موت کا جھٹکا جس کے لیے حیات ابدی کا دروازہ کھول دیتا ہے، مگر یہاں پر نقادانِ اقبال کے ساتھ ہی اقبال کے مداحوں کو بھی یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اقبال نبی و رسول نہیں کہ اس کے فکر و عمل میں ثبات و یکسانی اور حقائق کی یکسان تعبیر ہر وقت قائم رہے، تلون و تلوین شاعر کی فطرت ہے، وہ وادی وادی میں گھومتا ہے، اور اس کے قول و فعل میں یک رنگی کا فقدان ہوتا ہے، وہ حقایق کے بیان میں مبالغے اور غلو کو پوری بے احتیاطی سے برتتا ہے یہ حیثیت شاعر کی تقدیر ہے،

اقبال کی خود ستائی اور عدم اخلاص

ٹائمس آف انڈیا کے مضمون نگار کو شکایت ہے کہ اقبال کی شاعری میں اخلاص کی کمی ہے، اور وہ دائیں بائیں کے حالات کا اندازہ کرتے ہوئے اور تحسین و واہ واہ پر نظر رکھتے ہوئے شاعری کرتا ہے، اقبال پر یہ اعتراض کرتے ہوئے صاحب مضمون حق سے اس درجہ دور چلے گئے ہیں کہ جتنی دوری کا امکان ہو سکتا ہے، اقبال نے حقائق و واقعات کے جس احساس شدید کے ماتحت شاعری کی ہے

شاید صدیوں کی شاعری میں تلاش کرنے پر بھی اس کی مثال نہ مل سکے، (اقبال کی شاعری کی پیغمبرانہ شرح کرنے والے لوگوں نے راقم کو گذشتہ تیس پینتیس برسوں میں اس درجہ تلخ کر رکھا کہ راقم اس سلسلے میں اقبال کی ایک چوک کو بھی نظر انداز کرنا پسند نہیں کرتا، مضمون نگار سے عرض ہے کہ اپنے اور ساری دنیا کے اباحیت پسندوں کے محبوب ترین شاعر غالب کے دیوان کو اخلاص کی کسوٹی پر پرکھیں تو انھیں انشاء اللہ ندامت سے سر جھکا دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہے گا، غالب کی شاعری کا بہت بڑا حصہ تمسخر اور عوامی واہ واہ حاصل کرنے کے چٹکلوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔[1] صاحب مضمون نے غالب کے کمال کی طرف ہلکا سا اشارہ کیا ہے، لہٰذا ان سے گذارش ہے کہ وہ غالب کے ذیل کے اشعار پر غور کریں،

(۱) ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا — نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

(۲) اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا — جامِ جم سے تو میرا جامِ سفال اچھا ہے

اس شخص (غالب) کی شاعری کا بڑا حصہ اسی مسخرے پن پر مشتمل ہے، اور صاحب مضمون نہ معلوم کس تعصب کی بنا پر اُسے مرقع اخلاص قرار دیتے ہیں، مگر اقبال کو جو پہلے خود جلتا ہے اور جب اس جلن کے احساس سے آہ و واہ شروع کرتا ہے، تو تمام محفل جل اٹھتی ہے، صاحب مضمون غیر مخلص اور تماشئی بتاتے ہیں، عجب نہیں کہ وہ ابھی تک اخلاص کے مفہوم ہی کو نہ سمجھ سکے ہوں ورنہ وہ کم از کم عدم اخلاص کا اتہام اقبال پر نہ لگاتے،

دو واقعے

(۱) پہلی جنگ عظیم کا جب خاتمہ ہوا تو ترکوں کا سارا نظام خلافت تقریباً تتر بتر ہوگیا تھا، اس زمانہ میں اقبال نے اپنی نظم "خضر راہ" لکھی جو انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں خود اقبال نے پڑھ کر سنائی، راقم اس زمانہ میں لاہور میں زیر تعلیم تھا، مگر جلسہ میں موجود نہ تھا، جلسہ ختم ہونے کے بعد جب لوگ گھروں کو لوٹے تو شہر کی

[1] معارف: صوفی صاحب کے اس خیال سے پورا اتفاق نہیں،

مسلم بستی ایک ماتم کدہ بن گئی تھی، کہا جاتا ہے کہ جب مرحوم نے ذیل کا شعر پڑھا،

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل

خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاک حجاز

تو شاعر کی ہچکی بندھ گئی اور محفل تو حشر کدہ بن گئی، آج بھی یہ شعر وہی کیفیت پیدا کر دیتا ہے، لیکن شاعر کے اس جذبہ کی قدر کرنے کے لیے پاک اور حساس دل کی ضرورت ہے اگر انسان اس دولت سے محروم ہو تو پھر اس دولت کو پرکھنے کی اور کوئی کسوٹی نہیں،

شاعری کے معیار اخلاص کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا عین واقعہ ہے کہ اقبال اخلاص کا ایک لاوا ہے جو موقع بہ موقع پھٹ پڑتا ہے، اور ارد گرد کی بستیوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے،

(۳) اقبال کا عرصے تک یہ معمول تھا کہ وہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں ایک آدھ نظم پڑھا کرتا تھا، "خضر راہ" کے دوسرے ہی سال اقبال نے "طلوع اسلام" نام کی اپنی نظم پڑھی، اس سال کے دوران سیاست کی دنیا میں بڑے بڑے تغیرات رونما ہو چکے تھے، مثلاً یہ کہ ترکوں نے خلافت اسلامی کی ذمہ داری کو قبول کرنے سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے اپنے آپ کو نیشنل حدود کے اندر محدود کر لیا تھا، مگر اسی ہوم لینڈ کی حدود کو منوانے کے لیے ترک نوجوان سرگیف ہو چکا تھا، لہذا اس سارے سوال کو طے کرنے کے لیے جو کانفرنس (لوزان کانفرنس) ہوئی، اس میں ترکی ہوم لینڈ کے سوال کو تقریباً ترکوں کے شرائط پر حل کیا گیا جس سے مسلمانان ہند میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، ڈاکٹر اقبال نے اسی خوشی کی لہر کی تعبیر اپنی نظم "طلوع اسلام" میں کی، راقم اس دفعہ خود اس اجلاس کے سامعین میں شریک تھا، راقم کے کانوں میں اقبال مرحوم کی پر ترنم آواز اب بھی گونج جاتی ہے، اور اشعار کے ساتھ مرحوم کی بے ساختہ ایکٹنگ بھی نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی ہے،

مثلاً ذیل کے شعر کے ساتھ مرحوم نے ایک دفعہ مشرق کی طرف اور دوسری طرف مغرب کی طرف جھک کر جو ایکٹنگ کی وہ بھولنے والا نہیں، اس لئے کہ اس موقع پر ایک ایکٹر ایکٹنگ نہیں کر رہا تھا، بلکہ ایک مجذوب حال کھیل رہا تھا، وہ اپنے اندرونی احساس سے مجبور ہو کر کچھ کر رہا تھا، اسے شعوری طور پر کرنا شاید وہ اپنی توہین سمجھتا، عوام کی واہ واہ کو حاصل کرنے کے لئے ترنم اور ایکٹنگ کو کام میں لانے والے اور ہوتے ہیں اور اپنے اندرونی واردات واحساسات سے مغلوب ہو کر کمال بے بسی سے تڑپ جانے والے اور ہوتے ہیں، انھیں آپ اقبال ورومی کہہ سکتے ہیں، بلاشبہ اقبال میں اس بات کے لیے بے پناہ تڑپ پائی جاتی ہے کہ اس کے احساسات سارے معاشرے کو اسی طرح اپنی گرفت میں لے لیں جس طرح انھوں نے اقبال کو لے رکھا تھا مگر یہ داد طلبی کا شعبہ ہرگز نہیں ہے، بلکہ شاعری کی حدود کو پھاند کر اصلاح معاشرہ کے اسٹیج پر کام کرنے والوں کا حصہ ہے، اپنے مولا سے اقبال کی دعا تھی کہ ع میرا نور بصیرت عام کر دے

اس کی علمی صلاحیت ایک شاعر کی تھی، مگر اس کا دلی جذبہ ایک مصلح کا تھا، معلوم نہیں اقبال کو اس کا احساس کبھی ہوا ہے کہ نہیں مگر امر واقعہ یہ ہے کہ وہ سعدی و رومی کا درمیانہ جوڑ تھا، اقبال میں سعدی کی افادیت اور رومی کا جذبہ دونوں جمع ہو گئے تھے، اور مختلف مواقع پر اپنا اپنا مظاہرہ کرتے رہتے تھے اور اقبال کو شکایت تھی کہ

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں   کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

اسی اعتبار سے اقبال اپنے منہ بولے مرشد رومی سے کہیں بڑا خادم انسانیت تھا

پھونک ڈالا ہے میری آتش نوائی نے مجھے   اور میری زندگی کا خود یہی سامان بھی ہے

سریت و تشکیک کا فقدان ٹائمس کے مضمون نگار اظہار و یقین سے بیزار محسوس ہوتے ہیں لہٰذا اقبال کی بے محابا ترجمانی حقائق اور یقین بخشی کو وہ اقبال کے فضائل کے بجائے اس کے جرائم و نقائص کی فہرست میں شامل کر کے اس پر طعنہ زن ہیں،

سوال یہ ہے کہ انسانی قافلہ اظہار و یقین کی بنیاد پر اپنے سفرِ حیات کو جاری رکھ سکتا ہے یا اسے سریت و ابہام و بے یقینی کے ذریعے زندگی کے سفر کو کامیابی کے ساتھ طے کرنے میں مدد مل سکتی ہے؟ میں کہتا ہوں جو لوگ سریت و خفا و بے یقینی و تشکیک کے اندھے کنویں کا خود فریب مینڈک بننے پر قانع ہونا چاہتے ہیں، برٹینڈرسل کی طرح یہ بھی اعلان کر دیں کہ کاش میں حیوان ہوتا، انسانی احساس مفید و مضر اور شعور خیر و شر سے آزاد ہو کر جو کچھ کہا جاتا ہے، وہ حیوانی بے تمیزی ہے اور جب اسی بے تمیزی کو معیار بنا کر عام انسانی معاشرے کو اسے قبول کرنے کی دعوت دی جاتی ہے، تو وہ انسانیت دشمنی ہے، لہٰذا سریت و تشکیک کے بجائے اظہار و یقین کی دعوت دینے والا اقبال بلاشبہ خادم انسانیت ہے، اور لائق مدح ہے نہ کہ قابل ذم، بلاشبہ اقبال نے عمر بھر اظہار و یقین ہی کو اپنا مشن بنائے رکھا،

سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار — کہ بدتر موت سے ہے بے یقینی

مگر سریت و بے یقینی کے کوچے میں بھی بحیثیت شاعر وہ کبھی کبھی آجاتا تھا، اشعار ذیل ملاحظہ فرمائیں،

نہ من انجام و نے آغاز جویم — ہمہ رازم، جہان راز جویم
گر از روئے حقیقت پردہ گیرند — ہماں یوگ دگر را باز جویم
برہنہ حرف نگفتن کمال گویائیست — حدیث خلوتیاں جز برمز وایما نیست"

ایک شاعر اپنے فکر و احساس میں جتنا جامع ہو سکتا ہے وہ جامعیت اقبال میں پائی جاتی ہے، البتہ اس کا فکر و احساس انسانی حدود کے اندر کام کرتا ہے، وہ ٹیگور کی طرح معاشرے کا محبوب بننے کی کوشش نہیں کرتا، (ٹیگور نے بحیثیت شاعر اپنی آخری تمنا یہ ظاہر کی ہے کہ اسے معاشرے کی محبت حاصل ہو) ستار و سارنگی، ہارمونیم و طبلہ لیکر ہر وقت ایکسکرشن (Excurmsion) کے لئے تیار رہے اور معاشرے کو خوش کرتا رہے بلکہ اقبال معاشرے کے قافلہ کے ساتھ ایک ڈھنڈورچی کی طرح چلتا ہے، اور قدم قدم پر اُسے آگاہ کرتا رہتا ہے کہ اسے کہاں کہاں پڑاؤ کرنا ہے، اور کس کس وقت پڑاؤ ڈالنا اور کس کس وقت کوچ کرنا ہے، بلاشبہ وہ قافلہ سالار نہیں ہے وہ شاعر ہی ہے، مگر قافلہ کو خواب غفلت میں لے جانے کی لوریاں دینے کے بجائے اسے منزل و راہ منزل کے آداب و خطرات سے آگاہ کرنے کا کام کر رہا ہے، وہ نہ راہزن ہے نہ رہنما بلکہ زود باش و ہوشیار باش و غافل مباش کہنے والا نقارچی ہے، لہٰذا معاشرے کا خادم ہے اس کے مجموعہ اشعار کا نام بانگ درا ہے،

نیشنل ازم اور اقبال ٹائمس آف انڈیا کے مضمون نگار کو اس بات کا بھی افسوس ہے، کہ اقبال نے ابتدائی شاعری میں وطن کے ہر ذرہ کو دیوتا بنا کر پوجنے اور پجوانے کا جو پیشہ آذری اختیار کیا تھا، بعد میں اسے چھوڑ کر ابراہیمی بت شکنی کو اختیار کر لیا ایسے مضمون نگار نہ معلوم کن تعصبات کا شکار بن کر ایک عظیم خوبی کو برائی قرار دے رہے ہیں، وہ عالم انسانی کے اتحاد کی ضرورت سے پوری طرح بیگانہ محسوس ہوتے ہیں، معلوم نہیں ان لوگوں کے یہاں کوئی معیار خوب و زشت بھی ہے، یا محض حوادث کی ٹھوکروں کے سہارے وہ زندگی گزار رہے ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ

پوری سابقہ تاریخ میں بھی اور آج بھی انسان کے سارے اجتماعی فساد کی بنیاد یہی کنبہ پرستیاں اور نسلی حلقہ بندیاں رہی ہیں، انھیں بدی قرار دینے کے بجائے نیکی قرار دینا اور ان کی مخالفت کو ناقابل معافی جرم بتانا اور اخوت انسانی کی تبلیغ و ترویج چھین بجبیں ہونا تاریخ انسانی سے پہلے کی حیوانی و طبقاتی جنگ و آویزش کا حصہ تو ہو سکتا ہے، مگر وہ کسی صورت تاریخ انسانی کا حصہ نہیں ہے، اس طبقاتی جنگ و نفرت کا ایک دوسرے سے نفرت، بغض و عناد اور ایک دوسرے کی بیخ کنی و استیصال کا حیوانات کے تنازع للبقا کی تاریخ میں تو کچھ مفہوم ہو سکتا ہے لیکن جو لوگ نوع انسانی کو بھی اس حیوانی آئین جنگ و فساد کا پابند کرنا چاہتے ہیں، وہ بد ترین انسانیت دشمن ہیں، وہ حیوانات کی اندھی جبلت کے تقاضوں اور انسان کے اخلاقی و شعوری کردار میں فرق کرنے سے معذور ہو چکے ہیں، حیوانات کے جبلی جبر و مکر و ظلم اور انسانی اخلاقی مجاہدہ، افہام و تفہیم، تبلیغ و اصلاح، تعاون و توافق و باہمی خیر اندیشی جیسی مسلمہ اقدار میں فرق نہ کرنا اور سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنا انتہائی بے راہ روی ہے،

اقبال کو اچھی طرح معلوم ہے کہ سارا انسانی سلسلہ ایک ہی اخلاقی بھائی چارہ ہے، ان کے سارے کے سارے حقوق حیات و فرائض حیات ساری دنیا میں کمال یکسانیت رکھتے ہیں، لہٰذا وہ ان متعصبانہ کنبہ پرستیوں اور تنگ نظر فسطائی قومیتوں کے خلاف آواز بلند کرتا ہے تو بلا شک و شبہ وہ ایک عظیم خدمتِ انسانی کر رہا ہے، اس سلسلہ میں اسلام سے اقبال کی وابستگی کی بنیاد یہ ہے کہ اسلام نے ساری کائنات مذہب کے مقابل میں وحدت و اخوت انسانی کے اعتقاد پر سب سے زیادہ زور دیا ہے لہٰذا خاک وطن کے ہر ذرہ کو معبود قرار دینے کی ذہنی آزادی کو چھوڑ کر ملت ابراہیمی کو اپنانے کے لئے وہ

مجبور ہوگیا ہے، بحیثیت ایک خود شناس و خدا شناس انسان کے وہ اس کے لیے مجبور ہوگیا

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا　　نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے　　تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

اقبال بحیثیت ایک پیغمبر کے

ٹائمس آف انڈیا کے مضمون نگار نے اقبال کے مداحوں کے مبالغوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال کی پیغمبرانہ دعاوی پر دھیمی سی ناراضگی کا اظہار کیا ہے، حالانکہ اقبال کے مداحوں اور پجاریوں کی مدح سرائی کا یہی پہلو تھا جو سب سے زیادہ قابل تنقید تھا، مگر یہیں پہونچکر مضمون نگار کی قوت تنقید دم توڑ گئی ہے

ع وہ نادان گر گئے سجدوں میں جب وقت قیام آیا

ایک پیغمبر کی حالت

ایک پیغمبر کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اس کا نصب العین اس درجہ معین ہوتا ہے کہ پیغمبر کے لیے جاگتے سوتے ایک لمحہ بھی اس سے غفلت ممکن نہیں ہوتی، اس نصب العین تک پہونچانے والے ذرائع اس کے یہاں اس درجہ معین ہوتے ہیں کہ ان کا نام ہی صراط مستقیم پڑ گیا ہے، اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی دعوت کا خود کامل ترین نمونہ ہوتا ہے اور یہی معین نصب العین اور اسکے غیر لچکدار ذرایع اور ظاہر و باطن کی ہم آہنگ زندگی تعمیر انسانی کے لیے مدت ہائے دراز تک رہنمائی کا کام دیتے ہیں،

گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا　　بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

اس کے مقابل شاعر کی حیثیت یہ ہے،

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا،

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا، کردار کا غازی بن نہ سکا

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی"

مرے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
خرد میری ہے افرنگی مرا ایمان ہے زناری"

فکر من در فہم دیں چالاک و تست
تخم کردارے زخاک من نہ رست

اقبال نے اپنی سب سے زوردار نظم شمع و شاعر میں شمع سے بات چیت کے دوران شاعر کی حقیقت پر جو روشنی ڈالی ہے، اس نے شاعر کی حقیقت اور اس کی حدود کو انتہا درجہ تک واضح کر دیا ہے، (راقم کی نگاہ میں اقبال کی شاعری کا ایک بڑا شاہکار شمع و شاعر ہے،)

میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضمر مری فطرت میں سوز
تو فروزاں ہے کہ پروانوں میں ہو چرچا ترا

بلاشبہ بحیثیت ایک شاعر اپنی سب کمزوریوں پر اقبال کی نظر ہے، اور وہ کھلے بندوں ان کا اقرار بھی کرتا ہے، جیسا کہ اوپر کے اشعار سے ظاہر ہے، رہے وہ لوگ جو اقبال کے کلام کی پیغمبرانہ شرحیں کرتے ہوئے اس کے اتباع کی دعوت دیتے ہیں وہ بلاشبہ خیانت کار ہیں اور ع۔ "بت گر نے بت شکن کو بت ہی بنا کے چھوڑا" کا مصداق ہیں، یہ ٹھیک ہے کہ شاعری کی کائنات میں اور اس کے مقابل اقبال کو

اپنی اہمیت کا احساس ہے، اور اس نے اسے کہیں کہیں ظاہر بھی کر دیا ہے، مگر وہ کسی صورت خودستائی کے درجہ کی چیز نہیں ہے، اقبال نے شاعری کو برائے شاعری اختیار نہیں کیا تھا، بلکہ اس نے شاعری کو اصلاح معاشرہ کے ذریعہ کی حیثیت سے قبول کیا تھا، اور اسی حیثیت سے اس نے معاشرۂ انسانی کی خدمت کرنا چاہی، اور خوب کی، ایک شاعر معاشرے کے لئے اس سے زیادہ مفید ہو بھی نہیں سکتا، راقم کا قطعی یقین ہو گیا ہے کہ انسانی افادیت کے معاملہ میں اقبال رومی سے کہیں آگے نکل گیا ہے،

آخری بات راقم نے مضمون کا آغاز بھی اس بات سے کیا تھا، اور اس کا خاتمہ بھی اس بات پر کرتا ہے کہ اقبال اس دور کا تنہا وہ شاعر ہے، جو کم از کم شعر و ادب کے دائرہ میں موجودہ عالمگیر انتشار کو انسانی افادیت کا پابند کر سکتا ہے، البتہ اقبال کے مداحوں کے ساتھ ہی اسکے نقادوں سے بھی راقم کی گذارش ہے کہ وہ اقبال کی ہونے والی برسی کو اقبال کی اس حیثیت کو نمایاں سے نمایاں کرنے کے لیے کام میں لائیں؛

تکملہ (۱) اقبال کا نام رومی کے ساتھ اس طرح نتھی ہو گیا ہے کہ ایک کے متعلق غور و خوض کرنے کے ساتھ ہی دوسرے کا تصور آجاتا ہے، مگر یہ بات سن کر اکثر لوگوں کو حیرت ہوگی کہ اقبال اور رومی کی بنیادی فکر میں بڑا فرق ہے، اس سلسلہ میں یہاں صرف دو باتیں عرض ہیں۔

عشق (الف) اقبال اور رومی دونوں کے یہاں عشق بنیادی محرک عمل کی حیثیت رکھتا ہے، مگر یہ صرف لفظی اشتراک ہے، اس لئے کہ رومی کے یہاں عشق سے مراد محبت کی وہ انتہا ز سوز دگری ہے جہاں انسان کی توجہ ایک ایسے نقطہ پر مرکوز ہو جاتی کہ وہ پھر دوسری طرف متوجہ ہی نہیں ہو سکتا،

عشق آن شعلہ است کہ چوں برافروخت
ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت،

اور اقبال کے یہاں عشق سے مراد کسی جاندار کی زندگی کا وہ اندرونی زوردار داعیہ ہو جو اسے
مقصد زندگی کی طرف ڈھکیل دے۔ اس میں سارے حیاتی داعیے آجاتے ہیں،

بہ باغاں باد فروردیں دہد عشق — براغاں غنچہ چوں پرویں دہد عشق
شعاع مہر او قلزم شگاف است — بہ ماہی دیدۂ رہ بیں دہد عشق

(ب) تمام باطنیہ مفکرین کی طرح رومی کے یہاں ادراک کی حقیقت کا صرف ایک
ذریعہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ حواس ظاہری اور ان کے متعلقات کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ
پاس کرتے ہوئے انسان اپنے اندر گھس جائے،

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند — گر نہ بینی سر حق بر من بخند (رومی)

لیکن اقبال اس معاملے میں بھی اپنے پیر طریقت کی کھلی مخالفت کرتا ہوا سارے
حواس کو کامل طور پر استعمال کرنے کا مشورہ دیتا ہے، گویا عشق اور باطنی رجحان ڈونوں
میں اقبال اور اس کا منہ بولا شیخ طریقت دو جدا جدا راہوں پر مصروف سفر ہوتے ہیں،
اس بات نے اقبال کی انسانی افادیت کو رومی سے کہیں زیادہ کر دیا ہے،

اقبال اور ٹیگور

جس طرح اقبال کو اس بات پر شدید اعتراض ہے کہ احباب اُسے ایک
شاعر و غزل خوان قرار دیں حالانکہ اس نے شاعری کو چند مقاصد انسانی کو آگے بڑھانے
کے لئے اختیار کیا ہے، اسی طرح ٹیگور کو بھی اس بات پر شدید اعتراض ہے کہ اسے مصلح اور لیڈر قرار دیکر
اسکی زندگی پر من مانے حاشیے چڑھائے جائیں، اس لئے کہ وہ اصولاً نو عمر بچے بچیوں کا ہم جولی و ہم مشرب
ہے لہٰذا اس نے جو کچھ کہا ہے وہ اُسی مقام سے تعلق رکھتا ہے، اس نے بعض جگہ یہ بھی کہا ہے کہ وہ کائنات
فطرت کے نت نیا رنگ اختیار کرنے والے احوال و کوائف کا عکاس اور فوٹوگرافر ہے اسے ان اسرار و رموز سے کوئی
تعلق نہیں کہ یہ احوال و کوائف کیوں بدلتے ہیں، اور انکی پشت پر کون کون مصالح کارفرما ہیں ٹیگور کا کام تو صرف ان کی

عکاسی ہے، لہٰذا ان دونوں شعراء کے اپنے بیان کے مطابق ان کی حیثیتیں خود معین ہوگئی
ہیں، ٹیگور معاشرۂ انسانی کا ایک تحسین کار ہے، وہ معاشرے کا صاحب اسرار و نازدار نہیں
ہے، اسے کیوں اور کیا سے کوئی غرض نہیں ہے، اس کا کام تو یہ ہے کہ وہ پندرہ پندرہ بیس بیس
برس کے بچوں کی طرح کیمرہ ہاتھ میں لیکر صبح گھر سے نکلے اور شام کو مناظر فطرت کی ایک
اچھی خاصی فلم کا سامان کرتا ہوا اپنے پریم بسیرے یا شانتی نکیتن میں آجائے اقبال اس پیشے
کو افیون فروشی کا کاروبار قرار دیتا جو رات بھر اس فکر میں کروٹیں بدلتے ہوئے کاٹنے کا عادی
ہے کہ افیون کے اسی کاروبار سے معاشرے کو نجات دلا کر کس طرح اسے صحیح حقائق حیات
کے سامنے کھڑا کر دے، اقبال بھی انسانی زندگی کو دار الجہاد ہی جانتا ہے، مگر یہ حیوانات کی
طبقاتی جنگ کا ضمیمہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک جہاد مقدس ہے، جس کے بغیر انسان کی بالقوہ
صلاحتیں ایک مکمل اخلاقی شخصیت نہیں بن سکتیں حالانکہ موجودہ زندگی کی ساری تگ و دو کا
ماحصل یہی ہے، مرد مومن یا انسان کامل اسی مکمل اخلاقی شخصیت کا دوسرا نام ہے، جو جہاد
مقدس کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتی ہے، اقبال کا مرد مومن بھی یہی کچھ ہے،

افق نگاہ کا فرق

ٹیگور کے دوست و دشمن سب ہی کو اس کا اعتراف ہے کہ ٹیگور کا افق نگاہ
صرف بنگال تک محدود ہے، اور اقبال کا نقطۂ نگاہ سر تا سر آفاق گیر ہے، بلکہ کائنات گیر
ہے، اس لیے اس کا موضوع فکر انسان ہے، جو بظاہر ایک مختصر سی مخلوق ہونے پر بھی اپنے
باطن کے اعتبار سے انفس و آفاق سے کہیں زیادہ وسیع ہے دونوں کو اپنے ضمیر میں لئے ہوئے
ہے، اس وسعت کو باطنیہ کی عالمگیری پر قیاس کرنا بالکل درست نہیں ہے اس لئے کہ باطنیہ
کے یہاں آدمی کی انفرادیت کی نفی کے بعد یہ وسعت پیدا ہوتی ہے، وہ محض ایک منفی انداز
فکر ہے، جس کا واقعیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس کا کوئی سر دیا نہیں ہے نہ اس کی

کوئی تعمیری قدر و قیمت ہے، مگر اقبال انسان کو مرکز کائنات بتاتا ہوا کائنات کی وسعت کی طرف بڑھتا ہے،

اور غالب

غالب ایک بڑی بھاری اور نہایت ٹوٹی ہوئی تہذیب کے کھنڈرات کا نام ہے جہاں سانپ، بچھو، چوہے، چھپکلی، الو، شہباز، چڑیا، کبوتر سب ہی نے اپنے اپنے گھونسلے بنا رکھے ہیں، مگر ان کھنڈرات کی اور وہاں رہائش کرنے والوں انسانی دنیا کے لیے کوئی افادیت نہیں بلکہ حضرت ہی حضرت ہے، غالب کی زندگی دائمی یاس و ابدی شکست آرزو کو چھپانے اور دبانے کے لیے عجوبہ سازی اور چٹکلے بازی کا دوسرا نام ہے جہاں مقصدیت اور معنویت انسانیت اور ضروری متعلقاتِ انسانیت کا کوئی کام نہیں ہے، ٹیگور نے ایک آدھ دفعہ کہا تھا کہ وہ ایسے ہندوستان کی تعمیر چاہتا ہے جس کا کردار و رفتار فن رقاصی کا ماڈل ہو اور جس کے گفتار و اقوال موسیقی کے ترنم و آہنگ کا منظر ہوں گویا ایک تحسین کار کی حیثیت سے اس نے اپنے پیشے کی ماہیت بتا دی تھی مگر غالب کے یہاں زندگی کے کردار و گفتگو کو کسی آئین و ضبط کا پابند کرنا بے جا رکھ دی اور رسوم پرستی ہے، وہ تو ایک پاگل کی سڑی ہوئی لاش ہے،[1] جو کھلے ہوئے میدان میں پڑی ہے، اور جس میں ابھی کچھ رمقِ حیات موجود ہے، لہٰذا کبھی تو اس سے مجنونانہ ہنسی اور کبھی تکلیف دہ کراہنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، مگر زیادہ تر بے معنی ہوں ہاں کا سماں بنتا ہے، مگر جب اُسے کبھی کبھی مہلات و یا وہ گوئی اور ساتھ ہی معاشرتی کی عادات و اطوار کا احساس ہوتا ہے تو پھر وہ انھیں رازدارانہ طور پر یہ بھی بتا دیتا ہے "نالے کو پابندے اور پابند آہنگ کرنا دیوانگی ہے"، اس طرح وہ کمال ہوشیاری سے اپنے مجنونانہ اعمال و افکار پر پردہ ڈالتے ہوئے معاشرے میں اپنی گنجائش

---

[1] معارف کو اس سے اتفاق نہیں

نکال لیتا ہے، اسے چیلوں اور چھپکلیوں کا ہمراز و دمساز کہنا موزوں ہوگا۔[1]

مرتا ہوں آرزو میں مرنے کی　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی　　خود ہماری خبر نہیں آتی

کہہ گیا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

بے مقصدی، یاس اور لا اخلاقیت کے تین حیات کش عناصر سے غالب خستہ تن کی لاش بنی ہے، اور یہ تینوں چیزیں انسانی معاشرے کے لیے پیام مرگ کا حکم رکھتی ہیں اور اسے زندہ کرنے زندہ رکھنے اور مستقبل کے ادب عالیہ اور شعر کے ماڈل کی حیثیت سے قائم رکھنے پر لاکھوں نہیں کروڑوں روپے خرچ ہوگئے، اور کئے جا رہے ہیں جو خود کشی، انسانی خود کشی کے ہم معنی ہے، آج ساری انسانیت کی حالت ایسی ہو رہی ہے کہ اس کے سارے فکر و عمل میں عالمی انداز پر تعاون اور خیر اندیشی کی ایک لہر دوڑ جانی چاہیے اور انفرادی نمائش، ریا، خود سری کا خاتمہ ہونا چاہیے، موجودہ تہذیب کے عالمگیر سانچے کو تو بحال رکھا جائے مگر اس کے اندر سے لا اخلاقیت، لا روحانیت اور لادینیت کے سارے آثار کی کلی نفی کرتے ہوئے سارے اندرون خانہ کو اخلاقی و روحانی اقدار کے رنگ و روغن سے سجایا جائے، اس لئے کہ باقی کائنات کے مقابل انسانی کائنات کی ہی حقیقت ہے، انسان کائنات کے اندر اخلاقی خود ارادیت سے متصف ایک مخلوق ہے۔

"آدم کو اللہ نے اپنی صورت پر پیدا کیا"

---

[1] معارف کو اس سے اتفاق نہیں،

ابن عبد ربہ

از جناب جمیلہ شوکت صاحبہ، لاہور (پاکستان)

نام اور نسب شہاب الدین ابو عمر واحمد بن محمد بن عبد ربہ بن حدیر[1] بن حبیب بن سالم القرطبی مولیٰ ہشام بن عبدالرحمان معاویہ بن عبدالملک بن مروان الاموی[2] ہے۔ ابن خاقان نے ابن عبدربہ کی کنیت ابو عمرو[3] بتائی ہے لیکن اس کی تردید ابن عبدربہ کے معاصر شاعر یحییٰ القلفاط کے اس شعر سے ہوتی ہے ؎

"فود عینی ستراً من ابی عمرو[4]"

ابتدائی حالات ابن عبدربہ ۱۰ رمضان ۲۴۶ھ ؛ ۲۹ نومبر ۸۶۰ء بمقام قرطبہ پیدا ہوا[5]۔ اس کی اوائل زندگی کے حالات بہت کم ملتے ہیں، وہ ماحول اور خاندان جس میں اس نے نشوونما پائی، پردۂ خفا میں ہے صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ اس کا دادا اندلس کے دوسرے اموی خلیفہ ہشام بن عبدالرحمان الداخل کا آزاد کردہ غلام تھا۔ ابن عبدربہ نے قرطبہ ہی میں تربیت[6] پائی اور یہیں تعلیم حاصل کی۔

ابن عبدربہ نے غربت اور افلاس کی گود میں آنکھ کھولی، لیکن بہت جلد ذہانت و فطانت کی بدولت اندلس کی تاریخ ادب میں نمایاں مقام حاصل کر لیا[7]، اور اسے خلفائے وقت کے دربار میں رسائی حاصل ہو گئی، جس کے بعد اس کی شہرت مشرق و مغرب میں پھیل گئی۔

جہاں تک ابن عبدربہ کے اساتذہ کا تعلق ہے، سوائے ابن الفرضی کے کسی نے ان کی طرف راہنمائی نہیں کی، وہ کہتا ہے کہ ابن عبدربہ نے فقہ کی تعلیم خشنی، بقی بن مخلد[8]

---

[1] یاقوت حموی نے حدر لکھا ہے لیکن ناشر نے حاشیہ میں تصحیح کر دی ہے یاقوت ۲۰ : ۶۷ [2] ابن خلکان ۱ : ۴۴، ابن الفرضی ۱ : ۳۷، الضبی، ۳۷ [3] ابن خاقان، ۵۱ [4] المقری ۲، ۱۹۱ : [5] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۲ : ۴۵۲ [6] ابن الفرضی ۱ : ۳۷ [7] یاقوت ۲ : ۶۸ [8] بقی بن مخلد بن یزید القرطبی م ۲۷۶ھ (یاقوت ۲۰ : ۳۶۸)

اور ابن وضاح[11] جیسے چوٹی کے علماء سے حاصل کی[12]۔ اس کے علاوہ اس نے تمام مروجہ علوم تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ، موسیقی وغیرہ میں بھی دسترس حاصل کی، لیکن ان تمام علوم میں سے شاعری کی طرف اس کا رجحان زیادہ تھا[13]۔

قرطبہ کی تمدنی اور معاشی حالت قرطبہ، جیسا کہ ہمیں مختلف مصادر سے معلوم ہوتا ہے، اس زمانہ میں علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا، مغرب میں اسے وہی مقام حاصل تھا جو مشرق میں بغداد کو، قرطبہ میں بغداد کی طرح الرصافۃ[14] تھا، قرطبہ کے بارے میں ابن حزم کا قول نقل کرتے ہوئے المقری نے قرطبہ کو اہلِ علم و کمال کا مرکز بتایا ہے[15]، وہ لکھتا ہے:

فی جوانبه من البساتين والمروج	اس کے اندر گرد باغوں اور چراگاہوں نے
ما زاده نضارة و بهجة[16]	اس کی شادابی اور رونق کو بڑھا دیا۔

اہل اندلس علم و ادب کے بہت شوقین تھے۔ وہ اس جذبہ کی تسکین کے لئے مشرق کے دور دراز ملکوں کا سفر کرتے اور اساتذہ سے مستفید ہوتے، اسی طرح اہل مشرق بھی اندلس میں تحصیل علم کے لئے آتے، مقری نے ایسے لوگوں کی ایک طویل فہرست دی ہے[17]۔

اندلس کی اموی حکومت بغداد کی عباسی حکومت کی حریف تھی، اہل اندلس اہل مشرق سے کسی میدان میں بھی پیچھے رہنا پسند نہیں کرتے تھے، وہ علمی و ادبی ارتقاء میں ان کا تتبع کرتے، کیونکہ بغداد ان دنوں علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا؛ خلفاء نے عوام کے لئے مدرسے اور لائبریریاں قائم کیں کثیر رقم خرچ کر کے دوسرے ملکوں سے کتابیں فراہم کیں، ان عوامی لائبریریوں کے علاوہ ذاتی لائبریریاں بھی قائم ہوئیں حکم ثانی کی ذاتی لائبریری میں چار لاکھ کتب کا ذخیرہ موجود تھا[18]، اسی خلیفہ نے کتاب الاغانی کے مصنف ابوالفرج کو ایک ہزار دینار

---

[11] ابن وضاح م ۲۸۶ھ (الدیباج، ۲۳۹) [12] ابن الفرضی ۱ : ۳۷ [13] یاقوت ۲، ۲ : ۶۸ [14] معجم البلدان ۴ : ۵۹
[15] المقری ۲ : ۱۲۸ [16] المقری ۲ : ۱۵۲ [17] المقری ۲ : ۵۱ بعد [18] نکلسن : ۴۱۹

صرف اس غرض سے بھیجے گردہ کتاب کمل ہونے پر پہلا نسخہ اسے بھیجے[۱] اس ادبی سرگرمی کا دائرہ صرف اہلِ عرب اور موالی تک ہی محدود نہ تھا بلکہ مسیحی بھی علوم عربیہ کے بڑے دلدادہ تھے۔ ان کا پادری یولوجیوس (Eulogius) کہتا تھا کہ مسیحی اپنی زبان بالکل بھول گئے ہیں، یہاں تک کہ ہزار میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو لاطینی کا ایک کلمہ تک صحیح لکھ سکے[۲]، بقول لین پول

They never sheke the name of jeous chriol witho ut adding May god dless him. ([۳])

ترجمہ: وہ یسوع مسیح کا نام کبھی بغیر رحمۃ اللہ علیہ کا اضافہ کیے ہوئے نہیں لیتے تھے۔

اہلِ اندلس کو غنا سے خاص لگاؤ تھا، شرفائے شہر ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، زریاب مغنی اسی عہد کا ایک نامور موسیقار ہے[۴] اس ماحول اور تاریخی پس منظر میں ابن عبدربہ کی علمی و ادبی شخصیت کی نشوونما ہوئی۔

اخلاق و عادات ابن عبدربہ زندگی کے بیشتر حصے میں ایک ظریف ادیب نظر آتا ہے، وہ خوشی اور طرب کی تلاش میں رہتا تھا، موسیقی سے بھی اسے خاص شغف تھا، الفتح بن خاقان نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ابن عبدربہ ایک دفعہ قرطبہ میں کسی امیر کے محل کے نیچے سے گذر رہا تھا کہ اچانک اس کے کان میں گانے کی آواز آئی، اس آواز نے اس کے حواس کو مشتعل اور عقل کو مدہوش کر دیا، وہ رک گیا اور صاحب قصر کو یہ اشعار لکھ بھیجے[۵]

یا من یضن بصوت الطائر الغرد	ما کنت احسب هذا البخل فی احد
لو ان اسماع اهل الارض قاطبة	اصغت الی الصوت لم ینقص ولم یزد
فلا تضن علی سمعی تقلده	صوتا یجول مجال الروح فی الجسد
اما النبیذ فانی لست اشربه	ولست آتیک الا کسوتی بیدی

ترجمہ: اے وہ شخص جو (دوسروں سے) چہچہانے والے پرندہ کی آواز (سننے کے معاملہ میں) بخل کرتا ہو میں نہیں خیال کرتا کہ کوئی شخص اتنی معمولی سی چیز کے لئے بخل کرتا ہو۔

۲۔ اگر تمام اہل زمین کے کان بھی اس آواز کی طرف متوجہ ہو جائیں، تو یہ چیز اس کی آواز کو نہ کم کرے گی اور نہ زیادہ

۳۔ تو مجھ سے نغمہ سن لینے پر بخل نہ کر، بلکہ اس آواز کے ساتھ مجھ پر احسان کر، وہ آواز جو جسم میں روح کی طرح جولانی کر رہی ہے۔

۴۔ جہاں تک نبیذ کا تعلق ہے، وہ میں پیتا نہیں، اور میں تیرے پاس نہیں آؤں گا مگر اس طرح کہ میرے ہاتھ میں میرا (اپنا) روٹی کا ٹکڑا ہوگا۔

مالک نے جوں ہی یہ اشعار پڑھے، نیچے دوڑا آیا اور ابن عبدربہ کو اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ ابن عبدربہ العقد میں غنا کے متعلق یوں کہتا ہے:

وبعد فهل خلق الله شیئا	کیا عمدہ آواز سے بھی زیادہ اللہ نے
اوقع بالقلوب واشد اختلاسا	دلوں کو متاثر کرنے اور عقل کو سلب کرنے والی
للعقول من الصوت الحسن لاسیما	کوئی چیز پیدا کی ہے، بالخصوص ایسی آواز جو
اذا کان من وجه حسن[۱]	رخ زیبا رکھنے والے کی جانب سے ہو۔

شراب کے متعلق وہ کہتا ہے:

وحاملة راحا علی راحة الید	موردة تسعی بلون مورد

[۱] نکلسن: ۴۱۹ [۲] Spanish Islam 268

[۳] The Moors in Spain 86 [۴] نکلسن: ۴۱۸

[۵] مطمح ۵۱، ارشاد الاریب ۲: ۶۸، ضبی ۱۳۸

[۱] العقد الفرید ۷: ۴

متی ما تری الابریق للکأس راکعاً — تصلّ له من غیر طهر وتسجد

علی یاسمین کاللجین و نرجس — کاقراط در فی قضیب زبرجد

بمثلک وهذی فاله لیلک کلّه — وعنها فسل لا تسئل الناس عن غد[1]

ترجمہ ا۔ اور کتنی ہی شراب کو ہتھیلی پر اٹھا کر لانے والی عورتیں ایسی ہیں جو سرخ لباس میں ملبوس ہیں اور سرخ رنگ (کی شراب) کو تیزی سے لاتی ہیں۔

۲۔ جب ان میں سے کوئی دیکھتی ہے کہ صراحی پیالے کی طرف رکوع کر رہی ہے تو وہ اس کے لئے وضو کے بغیر نماز پڑھنے لگتی ہے اور سجدہ کرتی ہے۔

۳۔ چنبیلی پر جو چاندی کی طرح ہے اور نرگس پر جو زمرد کی ٹہنیوں پر موتیوں کی بالی کی طرح ہے۔

۴۔ اس شراب اور اس (ساقیہ) کے ساتھ رات بھر لطف اندوز ہوتا رہ اور اس کے بارے میں پوچھ اور لوگوں سے کل کے بارے میں سوال نہ کر۔

ہمیں اس کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عورتوں کی مجالس میں بھی اٹھتا بیٹھتا تھا، زندگی کے آخری ایام میں، جیسا کہ اس کے اشعار سے مترشح ہے، وہ اس لہو ولعب کی زندگی سے تائب ہو گیا تھا یہاں پر وہ ابو نواس کے مماثل ہو جاتا ہے جو خلیفہ امین کے قتل کے بعد شراب اور رنگ رلیوں کی محفلوں سے تائب ہو کر پاکیزہ زندگی کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ ابن عبد ربہ نے آخری عمر میں غزل گوئی ترک کر دی اور زہد و تقویٰ پر اشعار کہنے لگا جس کا نام اس نے "محصات"[2] رکھا، ان اشعار کے ذریعہ اس نے سابقہ عشق و مستی کی شاعری کا اسی بحر اور قافیہ میں ناصحانہ اور زاہدانہ شاعری کے ذریعہ جواب دیا، وہ اپنی گذشتہ زندگی پر ایک نادم شخص کی طرح نظر ڈالتے ہوئے کہتا ہے:

زمان کان فیه الرشد غیًّا — وکان الغیّ من رشادی[3]

---

[1] یتیمۃ الدہر ۲: ۶۲، العقد ۶: ۲۵۴ [2] یاقوت حموی ۲: ۶۹ [3] یتیمۃ الدہر ۲: ۶۹

ترجمہ۔ ایک ایسا زمانہ تھا جب میں بھلائی کو سرکشی (سمجھتا تھا) اور سرکشی کو بھلائی خیال کرتا تھا۔

ابن عبد ربہ شعرائے وقت کی طرح دربار اموی سے وابستہ ہو گیا۔ شاہی دربار تک اس کی رسائی کس طرح ہوئی، کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ممکن ہے وہ اپنے وقت کے علم دوست اور ادب نواز خلفاء کی دعوت پر دربار سے منسلک ہو گیا ہو یا انھوں نے ابن عبد ربہ کے بلند پایہ اشعار کا شہرہ سن کر اپنا مقرب بنا لیا ہو۔ دربار سے وابستہ ہونے کے بعد وہ خلفاء کی مدح سرائی میں مصروف ہو گیا۔

مذہب اہل اندلس ابتداء میں اوزاعی مذہب کے پیرو تھے، لیکن حکم بن ہشام کے عہد سے انھوں نے مالکی مذہب اختیار کر لیا[1]، چنانچہ ابن عبد ربہ بھی مالکی مذہب کا پیرو تھا۔ مگر وہ تمام مذاہب کی قدر کرتا اور غلو سے بچتا تھا، لیکن صاحب البدایہ نے خیال ظاہر کیا ہے کہ العقد کے مطالعہ سے ابن عبد ربہ کا میلان شیعیت کی طرف معلوم ہوتا ہے

مغربی عصبیت مغرب کی اموی حکومت مشرق کی عباسی سلطنت کی حریف تھی اور یہ مخالفت صرف میدان سیاست تک ہی محدود نہ تھی بلکہ میدان علم و ادب پر بھی غالب نظر آتی ہے، اندلس کے عرب و موالی ہر میدان میں اہل مشرق کو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ وہ کسی میدان میں بھی ان سے کمتر نہیں، اس باہمی مقابلہ کا ایک اچھا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب کی یہ نوزائیدہ اموی سلطنت علم و ادب، صنعت و حرفت، غرض ہر لحاظ سے عباسی حکومت کی سطح پر آ گئی، لہٰذا بہترین علماء، ادباء، فقہا، محدثین، اطباء، فلسفہ میں دسترس رکھنے والے اور فلکیات کے ماہر پیدا ہوئے، جن کی گونج نہ صرف عالم اسلامی بلکہ یورپ میں بھی سنائی دیتی ہے، اور حق تو یہ ہے کہ یورپ تہذیب و تمدن، علم و ہنر اور صنعت و حرفت غرض ہر میدان میں اندلس کا رہین منت ہے۔

اس عہد کے ادباء و شعراء کا رجحان یہ تھا کہ وہ جب مشرق میں کسی ادیب، شاعر یا عالم کا چرچا

---

[1] مقری ۲: ۱۵۸

منتے تو اس کی تقلید کی کوشش کرتے اور ہر طرح سے اسے نیچا دکھانے کی سعی کرتے۔ اس طرف ابن عبدربہ کا میلان خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنی کتاب کا بیشتر حصہ اہل مشرق کے حالات کے لئے وقف کیا ہے، لیکن وہ اس تعصب سے بالکل عاری نہیں، وہ اکثر مقامات پر مشرق کے ادبا و شعراء سے مقابلہ کرتا نظر آتا ہے۔ العقد کے مقدمہ میں اس کی تصریح ملتی ہے۔[1]

جب وہ مشرق کے کسی شاعر کے اشعار بطور نمونہ پیش کرتا ہے تو پھر اسی موضوع اور اسی ردی میں اپنے اشعار بھی لاتا ہے۔[2] وہ اپنے ممدوحین کی خوب تعریف کرتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے قصائد مبالغہ سے مبرا ہیں، وہ عبدالرحمٰن الداخل کو صقر قریش[3] کہتا ہے، اسی طرح خلیفہ الناصر کے غزوات کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

ولم یکن مثل هذه الغزوات للملك	اسلامی اور جاہلی دور کے کسی بادشاہ کے
من الملوك فی الجاهلیة والاسلام[4]	غزوات بھی اس بادشاہ کے غزوات کی طرح نہ تھے۔

تاہم ابن عبدربہ نے العقد میں اہل مشرق کے ساتھ خصوصی اعتنا کیا ہے، کیونکہ اندلس کی تمام علمی و ادبی ترقیوں کے باوجود اس کا یہ عقیدہ تھا کہ علوم عربیہ دراصل مشرق میں پروان چڑھے ہیں جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب الصاحب ابن عباد (م ۳۸۵ھ) وزیر آل بویہ نے مشرق میں اس کتاب کا چرچا سنا تو نہایت اشتیاق سے اس کے مطالعہ کی خواہش ظاہر کی لیکن جب دیکھی اور مشارقہ کے حالات سے مملو پائی، تو کہا:

هذه بضاعتنا ردت الینا ظننت ان	اس میں تو ہماری ہی پونجی ہم کو واپس کر دی گئی ہے
هذا الکتاب یشتمل علی شیء من اخبار بلادهم[5]	میرا تو یہ خیال تھا کہ اس میں غالباً خود انکے ملک (اندلس) کے حالات ہوں گے

بحیثیت ناقد | ابن عبدربہ اپنے تنقیدی نظریات میں ابن قتیبہ کا ہم خیال تھا، علامہ ابن قتیبہ نے

[1] العقد ۱ : ۳ [2] العقد ۶ : ۲۱۱ [3] العقد ۵ : ۲۱۴ [4] العقد ۵ : ۲۲۴ بعد
[5] یاقوت ۲ : ۶۶۔ ابن عباد کا قول قرآن کی مندرجہ ذیل آیت سے ماخوذ ہے (القرآن ۱۲ : ۶۵)

نی تنقید نگاری میں انقلاب پیدا کیا اور حسن و قبح کا معیار پہلی بار شعر کی عمدگی اور پستی کو ٹھہرایا۔[1] اور ابن عبدربہ نے بھی اسی طرح کے خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انصاف کی بات یہ ہے کہ اہلِ فضل و کمال کی تقدیم و تاخیر سے اس کو نفع و نقصان نہیں پہونچتا۔[2]

وفات | آخر عمر میں ابن عبدربہ پر فالج کا حملہ ہوا اور اسی کے اثر سے یہ روشن چراغ قرطبہ میں ۸۱ سال ۸ ماہ اور ۸ دن[3] دنیا کو اپنے فضل و کمال سے پرنور رکھنے کے بعد اتوار ۱۸ جمادی الاولیٰ ۳۲۸ھ[4] مطابق ۲ مارچ ۹۴۰ء کو گل ہو گیا اور دوشنبہ کے دن مقبرہ بنی عباس میں دفن کر دیا گیا۔[5]

ابن عبدربہ بحیثیت شاعر | ابن عبدربہ اندلس کے خلفائے بنی امیہ کا امیر الشعراء تھا، چار خلفاء[6] جن کے دور حکومت میں وہ زندہ رہا، مدح سرائی میں مصروف رہا، ابن عبدربہ کے بہت کم اشعار ہم تک پہونچے ہیں، اگر اس کی شاعری کا وہ تمام ذخیرہ جو بقول حمیدی بیس جلدوں میں تھا، ہم تک پہونچتا تو یقیناً ابن عبدربہ کا مقام اس سے بلند تر ہوتا، وہ اشعار یا قصائد جو ہمیں مختلف کتب ادب اور اس کی اپنی کتاب العقد میں ملتے ہیں، تقریباً ۱۴۰۰ ہیں، یہ قلیل تعداد ہی اس کو اپنے عہد کا بہترین شاعر ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس نے شاعری کی تمام اصناف مثلاً غزل، مرثیہ، مدح، ہجو، وصف نگاری وغیرہ میں طبع آزمائی کی، اس کے خیالات نادر اور بلند ہیں، اس کا ہر شعر اس بات پر شاہد ہے کہ اسے عربی زبان پر پوری قدرت حاصل تھی، خیالات میں ندرت، حسن، موضوعات میں تنوع، وسیع علم اور پھر ناقدانہ نظر و فکر، اس کے محبوب جواہر پارے ہیں، وہ موسیقی جو اس کے

[1] کتاب الشعر ۵ [2] العقد ۶ : ۲۰۵ [3] ابن الفرضی ۱ : ۳۷، یاقوت ۲ : ۶۷، بغیہ میں ۸۱ سال اور ۸ ماہ اس کی عمر مذکور ہے، مقری ۸۲ سال بتاتا ہے ۲ : ۱۹۲ [4] ابن خلکان ۱ : ۳۵، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۲ : ۳۵۲ [5] ابن خلکان ۱ : ۳۵ [6] محمد بن عبدالرحمٰن (۲۳۸ھ ۔ ۲۷۳ھ) منذر بن محمد (۲۷۳ھ ۔ ۲۷۵ھ) عبداللہ بن محمد (۲۷۵ھ ۔ ۳۰۰ھ) اور عبدالرحمٰن بن محمد (۳۰۰ھ ۔ ۳۵۰ھ) (لین پول، ۲۱)

اشعار میں کبھی کبھی پیدا ہوتی ہے، شعر کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے، اس کی تشبیہات اور استعارے نہایت عمدہ اور نادر ہوتے ہیں۔

اہل نظر علماء نے ابن عبدربہ کا اعتراف کیا ہے، ابن خلکان کہتے ہیں: ولہ دیوان شعر جید[1] صاحب یتیمۃ الدہر نے لکھا ہے: شعرہ فی نہایۃ الجزالۃ والحلاوۃ وعلیہ رونق البلاغۃ والطلاوۃ[2]۔ فتح بن خاقان بھی اس کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں، کہتے ہیں: وان لہ شعراً انتھی منتہاہ[3]۔ ابن شرف القیروانی نے بھی ابن عبدربہ کے مختلف اصناف سخن پر قدرت، اور غزل، مدح، ہجو وغیرہ میں جولانی طبع کا اعتراف کیا ہے[4]۔

مدح | ابن عبدربہ نے مدحیہ قصائد میں نام پایا ہے، وہ صرف خلفاء ہی کی مدح نہیں کرتا بلکہ اہل علم اور امراء کو بھی اپنی مدح کا موضوع بناتا ہے: اس نے "صاحب القبلہ" ابو عبیدہ کی مدح میں بھی کچھ اشعار کہے ہیں[5]، وہ اپنے مدحیہ قصائد میں ممدوح کی عادات حسنہ اور خصائل حمیدہ کا ذکر کرتا ہے، اس کی شجاعت اور سخاوت پر فخر کرتا ہے اور اس کی جود و سخا کو بارش اور سمندر سے تشبیہ دیتا ہے۔

خلیفہ عبدالرحمن بن محمد کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

یا ابن الخلائف ان ایام الغنیٰ	ایامک الخیر التی اغنیتنی
بنوالھا وسجالھا وثمالھا	اسقیتنی حتیٰ لقد اروبتنی[6]

ترجمہ: ۱۔ اے خلفاء کے بیٹے حقیقۃً خوش حالی کے دن تمہارا زمانہ خلافت ہے جس نے مجھے امیر بنا دیا ہے۔

۲۔ اپنی بخششوں اور ہر معمولی اور بڑی چیز کے ساتھ، انھوں نے مجھے پلایا، حتیٰ کہ خوب سیراب کر دیا۔ (باقی)

---

[1] ابن خلکان ۱: ۳۴ [2] ثعالبی ۲: ۶۵ [3] مطمع ۵۱ [4] رسائل البلغاء، ۳۲۳ [5] ابن الفرضی ۱: ۳۱۳ [6] ثعالبی ۲: ۵، العقد ۵: ۲۲۱۔

لاہور کے علمی تحائف

(۲)

از سید صباح الدین عبدالرحمن

تاریخ ارادت خان | یہ تاریخ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے لے کر فرخ سیر کے عہد تک کے واقعات کا بہت ہی اہم اور مستند ماخذ ہے، اس کا مصنف مرزا مبارک اللہ مخاطب بہ ارادت خاں متخلص بہ واضح تھا، اس کا خاندان چار پشتوں سے تیموری سلطنت کا خدمت گذار رہا، ارادت خاں موروثی خطاب بن گیا تھا۔ وہ اورنگ زیب کے جانشین شاہ عالم کے زمانہ میں چہار ہزاری منصبدار ہوا، شاعر بھی تھا، تصوف سے بھی ذوق رکھتا تھا اور اپنی تاریخ نویسی کا ثبوت زیر نظر کتاب لکھ کر دیا، جس میں اورنگ زیب کے بعد سے فرخ سیر کے عہد تک کی خانہ جنگیوں کی بہت ہی خوں چکاں داستان ہے، اس دور کی تاریخ اس کے بغیر نہیں سمجھی جا سکتی ہے، اسی لئے اس کے حوالے بہ کثرت تاریخوں میں آتے ہیں۔ اس کا انگریزی ترجمہ وارن ہسٹنگز کے سکریٹری جونیتھن سکاٹ نے ۱۷۸۶ء میں کیا، اس کا ایک ناقص اردو ترجمہ حیدر آباد سے بھی شائع ہوا، مگر اصل کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی تھی، پنجاب یونیورسٹی نے اس کو بھی شائع کر کے ایک مفید علمی کام انجام دیا ہے، اس کی تصحیح و تہذیب مولانا غلام رسول مہر نے کی ہے، جس کے بعد یہ یقین کر لینا چاہیے کہ اس میں تحریر اور تحقیق کی پوری خوش سلیقگی نمایاں طور پر ہوگی، مقدمہ میں مصنف کے خاندان کے ساتھ اس کے ذاتی حالات اس کی شعر گوئی، نثر نگاری اور زیر نظر کتاب کی اہمیت پر بڑا اچھا تبصرہ ہے، اس کے لکھتے وقت فاضل مرتب کو جو ذہنی اذیت اور کوفت محسوس ہوئی اس کی بھی اس میں عکاسی ہے، عالمگیر کے جانشینوں میں

ہولناک لڑائیاں ہوتی رہیں ان سے صدمہ پہونچنا لازمی ہے ، اس کا اظہار اس طرح جامع اور غمناک انداز میں کیا گیا ہے :

"ہر خانہ جنگی کے بعد جو فرد تاج و تخت کا مالک ہوا اسے عالمگیر ہی نہیں ، بیشتر کے کسی مغل بادشاہ سے بھی کوئی مناسبت نہ تھی ، بادشاہی اور حکمرانی کی اصل و اساس رعیت پروری ہے ، یہ اصل و اساس دل و دماغ سے محو ہوگئی ، پہلی خانہ جنگی کے بعد بہادر شاہ فرمانروا بنا ، لیکن نہ اسے یہ احساس کہ جو وسائل خانہ جنگی میں برباد ہوئے انھیں از سر نو مہیا کر لینا کتنا ضروری ہے ، اور آئندہ کے لئے اس تباہی خیز آتش فشاں کا دہانہ بند نہ کیا گیا تو انجام کیا ہوگا ، نہ یہ صلاحیت کہ اتنی وسیع سلطنت کے نظم اور اس کے مختلف اجزاء کو باہم پیوستہ و وابستہ اور محفوظ رکھنے کے تقاضے کیا ہیں ، نہ کارکنوں پر نظر ، نہ فرماں روائی کے واجبات ادا کرنے کا کوئی قاعدہ و ضابطہ ، نہ سابقین کے جمع کردہ ذخیروں سے ٹھیک ٹھیک کام لینے کا سلیقہ ، سلطنت ملی تو دیکھا کہ پونے دو سو سال میں دولت کے وسیع انبار فراہم ہوگئے ہیں ، ان پر ہاتھ ڈالا ، جا و بیجا لٹایا ، ظاہری طمطراق دکھایا ، وہ سمجھ لیا کہ اکبر و عالمگیر کی جانشینی کا حق ادا ہوگیا ۔"

مغلیہ سلطنت کے آخری فرماں رواؤں کی یہ سچی تصویر یہی ان کے زوال کے اسباب بھی ہوئے جن پر ایک اچھا مورخ مفصل بحث کرسکتا ہے ۔

اس کتاب کو ایڈٹ کرتے وقت ایک خاص بات کی رہنمائی کی گئی ہے ، اب تک یہ رواج رہا ہے کہ کسی ایک نسخہ کو متن بنا کر باقی نسخوں کا اختلاف عبارات حاشیے میں درج کر دیا جاتا ہے ، لیکن فاضل مرتب نے اختلافات کو سامنے رکھ کر متن کو حتی الامکان صحیح کرنے کی کوشش کی ہے ، تاکہ مطالب کی تشریح ہوسکے ، اختلاف کی توضیح بھی وہیں کی ہے جہاں ان کو خیال ہوا کہ عبارت میں اختلاف کی وجہ سے اصل مسئلہ کے سمجھنے میں اختلاف پیدا ہو جانے کا احتمال ہوا ، تصحیح کا یہ طریقہ

قابل اعتبار ہے ۔

دیوان دارا شکوہ ۔ دارا شکوہ اپنے علمی ذوق کی وجہ سے تیموری شہزادوں کا گل سرسبد تھا ، وہ ایک باکمال مصنف ، مترجم اور خطاط ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھا اور صوفی بھی ، اگر وہ مجمع البحرین نہ لکھتا اور رام چندر جی کی طرح اوتار ہونے کا دعویٰ نہ کرتا ، تو شاید اس کا وہ انجام نہ ہوتا جو ہوا ، وہ اوتار ہو کر تخت و تاج کا دعویدار ہوا ، اور جانشینی کی لڑائیاں بھی لڑا ، اس لئے اسکے سارے صوفیانہ خیالات مشکوک ہوگئے ، اس نے جہاں بہت سی کتابیں لکھیں اور ترجمے کئے وہاں اس نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا تھا ، لیکن یہ اب تک طبع نہیں ہوا تھا ، قلمی نسخوں کی شکل میں کتب خانوں میں پڑا تھا ، پنجاب یونیورسٹی لاہور نے اس کو بھی ۱۹۶۹ء میں شائع کرکے ایک کمی کو پورا کر دیا ہے ، اس میں دارا شکوہ کی ۲۱۵ غزلیں اور ۱۴۵ رباعیاں ہیں ، شروع میں جناب نبی احمد صاحب اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ارکیالوجی (آثار قدیمہ) کا ایک مقدمہ ہے ، جس میں دارا شکوہ کی تصانیف کا سیر حاصل جائزہ لینے کے بجائے ان کا سرسری ذکر ہے ضرورت اس کی تھی کہ اس کے تصانیف میں اس کے خیالات کی جو تدریجی نشو و نما ہوئی اس کا گہرا مطالعہ کیا جاتا ، اس سے اس کی شاعری کے صوفیانہ خیالات کو سمجھنے میں مدد ملتی ، اس کی شاعری فن و ادب کے لحاظ سے بلند نہیں ، اس کی غزلوں میں تغزل بالکل ہی نہیں ، البتہ اس کی رباعیاں اس کی غزلوں سے نسبتاً بہتر ہیں ، جن میں جہاں بعض اخلاقی باتیں بیان کی گئی ہیں وہاں اس نے اپنے وحدت الوجودی خیالات کی بھی ترویج کی ہے ، اس کی یہ رباعیاں تو وحدت الوجود کے عام تصورات و رجحانات کی ترجمانی کرتی ہیں :

ہمسایہ و ہم نشین و ہمرہ ہمہ اوست   در دلق گدا و کسوت شہ ہمہ اوست
در انجمن خرق و نہاں خانہ جمیع   باللہ ہمہ اوست ثم باللہ ہمہ اوست

آنکس کہ دریں جہاں نہ گوید ہمہ اوست
یا مغز ندا ند کہ بود عین پوست

چوں مرد یقیں شود براو وحدت ذات
پس مرگ برائے دفع غفلت نیکوست

وحدت الوجود کے ایسے خیالات بہت زیادہ قابل اعتراض نہیں، ایسی سرشاری میں صلح کل ہونا بھی چنداں مضایقہ نہیں:

بود بجہاں نکوتر از شرب ہیچ
باید کہ ترا بود جز او مطلب ہیچ

توحید گزیں و صلح کل پیش بگیر
بگذار تعصب کہ بود مذہب ہیچ

مگر اس کے بعد یہ پکار اٹھا کہ:

کافر گفتی تو از پے آزارم
ایں حرف ترا راست ہمی پندارم

پستی و بلندی ہمہ شد ہموارم
من مذہب ہفتاد و دو ملت دارم

اس کے بعد علمائے حق کو وحدت الوجود سے سوءظن پیدا ہو جاتا ہے، کفر کی پستی اور ایمان کی بلندی کو مساوی درجہ دینے سے شریعت محمدی پر اگر ضرب لگتی ہو تو یہ اسلامی وحدت الوجود نہیں، ایک بگڑا ہوا وحدت الوجود ہے، جو علمائے اسلام کے نزدیک قابل قبول نہیں، دارا شکوہ اگر اس قسم کے خیالات کا اظہار اپنے اشعار میں کرتا رہتا تو اس کے شاعرانہ خیالات زیادہ توجہ کے لائق نہ ہوتے، مگر جب وہ ان خیالات کا اظہار اپنی تصانیف حسنات العارفین، مجمع البحرین اور رسالۂ حق نما، سر اکبر اور جگ بشت کے ترجموں کے سلسلہ میں کرنے لگا تو مسلمانوں کے راسخ العقیدہ گروہوں میں اس کا برا ردعمل ہوا، اور جب وہ اس کا دعویدار ہوا کہ اس کو عرفان کی وہ دولت مل گئی جو کسی کو نہیں ملی، اور فضل و رحمت کے سارے دروازے اس کے دل پر کھل گئے تو اس دعوی کے بعد جب وہ تخت طاؤس کو حاصل کرنے کے لئے میدان جنگ میں اترا، تو راسخ مسلمانوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ تخت حاصل کرکے

اکبر کے دین الہٰی کی تجدید کر دے گا، اس حیثیت سے دارا شکوہ کو سمجھنے کے لئے دیوان دارا شکوہ کا مطالعہ اس کی اور تصانیف کے ساتھ ضروری ہے، اس لئے اس کی طباعت و اشاعت مفید بھی ہے

راقم نے اپنی کتاب بزم تیموریہ کے پہلے ایڈیشن میں دارا شکوہ کی علمی سرگرمیوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا تھا، مگر اس وقت دیوان دارا شکوہ کا کوئی نسخہ نظر سے نہیں گذرا تھا، اس لئے دارا شکوہ کے اشعار کا انتخاب خود اس کی تصانیف اور مختلف تذکروں سے کیا تھا، بزم تیموریہ اب مزید اضافہ کے ساتھ شائع ہو رہی ہے، اس کی پہلی جلد شائع ہو گئی ہے، دوسرے ایڈیشن میں دارا شکوہ کے اشعار کے انتخاب میں زیر نظر دیوان بہت کارآمد ہوگا، اس کے شروع میں جناب جہانگیر خاں صاحب کا مختصر لیکن پرمغز پیش لفظ ہے۔

گل رعنا۔ یہ غالب کے منتخب اردو اور فارسی کلام کا اولین مجموعہ ہے، اس کو ہندوستان میں جناب مالک رام صاحب نے بھی شائع کیا ہے، جناب سید وزیر الحسن عابدی صاحب کو غالب اور غالب کی ہر چیز سے وہی شیفتگی ہے جو مالک رام صاحب کو ہے، اسی لئے انھوں نے اس کا ایک علیحدہ ایڈیشن خود تیار کیا ہے، جو ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب لاہور سے دسمبر ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ تقریب کے موقع پر شائع ہوا، جناب سید وزیر الحسن عابدی کا شمار پاکستان کے ممتاز اہل قلم میں ہوتا ہے، انھوں نے زیر نظر کتاب کے اکیاسی صفحے کے مقدمہ میں اپنے قلم کا پورا جوہر دکھایا ہے، شاید اس کے لکھنے میں ان کو وہی خمار آلود لذت ملی ہوگی جو غالب کو کاسۂ تلین اولڈ ٹام کے شغل میں ملتی ہوگا، غالب کی کتاب کا نام گل رعنا ہے، اس لئے انھوں نے اس لفظ کی تلاش مزے لے لے کر موید الفضلاء، فرہنگ آنندراج، بہار عجم کے علاوہ وحشی، ظہوری، بیدار اور ایجاد وغیرہ کے اشعار میں بھی کی، اور پھر اس پھول کی تصویر اس طرح کھینچی ہے کہ اس پھول کے بیچ کی پنکھڑیاں زرد اور سرخ ہوتی ہیں،

زرد پنکھڑیوں والا دائرہ نما حصہ اوپر کو اٹھا ہوا ہوتا ہے، اور اردگرد کی قرمزی سرخ پنکھڑیاں نسبتہً کافی لمبی اور نیچے کو جھکی ہوئی ہوتی ہیں، اس کتاب میں گل رعنا کی اس تحقیق و تصویر کی چنداں ضرورت نہ تھی، مگر غالب کے پرستار کو غالب کی ہر چیز سے لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے، اس لئے گل رعنا سے ایسی دلچسپی کیوں نہ ہوتی گل رعنا چھپ کر لوگوں کے ہاتھوں میں نہ آتی تو غالب کی عظمت میں کوئی کمی نہ ہوتی اور نہ اس کی اشاعت سے ان کی عظمت میں کوئی اضافہ ہوا، مگر جناب وزیر الحسن عابدی اس کی ہر ہر سطر پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں جیسے منہ میں مصری کی ڈلی رکھ کر چبا رہے ہوں، انھوں نے تمام جزوی باتوں پر بحث کر کے غالب سے اپنی شیفتگی کا اظہار کیا ہے، مثلاً اس نسخہ میں بعض بندے غلط چھپ گئے یا رہ گئے ہیں، غالب نے اپنے دست نوشتہ نسخے میں ایفلکہ کے بجائے ولہ ہر جگہ لکھا ہے جو مجازاً صحیح ہے، حسرت موہانی نے گل رعنا کی تالیف کو قاضی القضاۃ کلکتہ سراج الدین علی خاں موجد موہانی کی فرمائش کا نتیجہ بتایا، جو صریحاً غلط ہے، انھوں نے مولوی سراج الدین احمد کو سراج الدین علی خاں خلط کیا ہے (ص ۲۷) گل رعنا کی کچھ غزلیں نہ نسخۂ حمیدیہ میں ہیں نہ نسخۂ شیرانی میں (ص ۲۹) گل رعنا میں تریسٹھ غزلیں ایسی ہیں جو بیاض غالب میں نہیں (ص ۳۰) یہ تریسٹھ غزلیں ۱۸۱۲ء اور ۱۸۱۶ء کی پیداوار ہیں (ص ۳۱) گل رعنا کا جو نسخہ مالک رام صاحب کے پاس ہے وہ جا بجا سہو القلم کا شکار ہوا ہے (ص ۳۲) گل رعنا اور کلیات غالب کے بعض قصیدے میں لفظی اختلافات ہیں (ص ۳۰) گل رعنا کی ایک ذی میں ۱۰۴ اشعار ہیں، کلیات میں پانچ زاید ہیں (ص ۳۸) غزلوں کے بعض اشعار کلیات میں زاید ہیں جو گل رعنا کے متن میں نہیں (ص ۳۹) گل رعنا کی ایک سو سترہ اردو غزلوں میں ستائیس مقطعے غالب کے تخلص کے ہیں اور باقی اسد تخلص کے (ص ۴۶) غالب نے گل رعنا کے شروع میں اپنا نام صرف اسد اللہ لکھا ہے، مگر آخر میں محمد اسد اللہ درج کیا ہے (ص ۴۹) وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں غالب نے ظہوری، بیدل، حزیں، فیضی، نظیری، عرفی، صائب کی ہم زمین اور ہم قافیہ غزلوں میں جو غزلیں کہی ہیں، ان کے مطلعے دئے ہیں جو سولہ صفحے پر مشتمل ہیں، ان سے فاضل مرتب کے خیال کے مطابق غالب کی عظمت فن اور

رفعت فکر کا اندازہ ہوگا، مگر غالب اور ان کی شاعری کچھ ایسی متنازعہ فیہ رہی ہے کہ جو باتیں ان کی مدح میں کہی جا سکتی ہے، وہی ان کی قدح میں بھی دہرائی جا سکتی ہے، اور جو باتیں ان کی قدح میں پیش کی جا سکتی ہے وہی ان کی مدح بھی بن سکتی ہے، یہ ضرور ہے کہ غالب نے اپنے فن کی عظمت اور فکر کی رفعت کا ثبوت اساتذۂ فن کی ہم زمین اور ہم قافیہ غزلوں میں غزلیں کہہ کر دیا، مگر ان کے کچھ ایسے ناقد بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ "تلون مزاجی اور شاعرانہ بوالہوسی کے ہاتھوں غالب کی زندگی کا بیشتر حصہ حیرانی و سرگشتگی میں گذر گیا، آج وہ مرزا جلال اسیر کے مقلد ہیں تو کل شوکت بخارائی کے، کبھی عرفی کی نقالی کرتے ہیں، کبھی نظیری کی، کبھی بیدل کا پیالہ چاٹتے ہیں، کبھی صائب کا، کبھی کسی کا کبھی کسی کا" اس نقد میں جو شدت ہے، اس کی بھی تردید آسانی سے ہو سکتی ہے، غالب کی ذات اور شاعری کی یہ مدح و قدح برابر جاری ہے، مگر ان کی ذات و شاعری دونوں کی کرامت ہے کہ جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے ان کی اور ان کی شاعری کی قدر بڑھتی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جناب سید وزیر الحسن عابدی صاحب کبھی غالب کی شاعری کی شاخ گل پر دکھائی دیتے ہیں، کبھی اس کی بزم گل میں نمودار ہیں، کبھی اس کے سایۂ گل کے نیچے بیٹھ کر اپنی لیاقت و قابلیت کی نکہت بیزی کی ہے۔

بیان واقع۔ یہ نادر شاہ کی تاریخ ہے، جس کو اس کے ایک ہندوستانی متوسل خواجہ عبدالکریم نے مرتب کیا، وہ کشمیر میں پیدا ہوا، شاہجہان آباد میں مقیم تھا، نادر شاہ نے دہلی کو جس طرح لوٹا اور برباد کیا، اس کو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس لئے اس نے دہلی پر نادر شاہ کے حملے سے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بہت ہی مستند ہے، اس نے نادر شاہ کی زندگی کے پورے حالات بھی لکھے ہیں جن کے مطالعہ کے بعد اس کتاب کے مصحح جناب ڈاکٹر کے. بی. نسیم (صدر شعبۂ فارسی، پشاور یونیورسٹی) کا خیال ہے کہ اس کی حقیقی عظمت کا اندازہ ہوگا، یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے وقت کا بڑا جری سپاہی اور اولوالعزم فاتح تھا، اس نے ایران کی تاریخ بھی بدل دی مگر اس برصغیر میں اس کی خوں ریزی،

سفاکی اور غارتگری نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ اس کا آنکھوں دیکھا حال خواجہ عبدالکریم نے جس طرح بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیس ہزار آدمی تہہ تیغ کئے (ص ۳۷) خود فاضل مصحح نے اس صفحہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ مقتولین کی تعداد اسی ہزار تک بتائی جاتی ہے (حاشیہ ص ۳۷) پھر وہ ہندوستان سے مال غنیمت کے طور پر جو چیزیں لے گیا، اس میں بعض مورخوں کے بیان کے مطابق تخت طاؤس کے علاوہ پچیس کروڑ کے جواہرات، پچیس کروڑ کی اشرفیاں اور چاندی کے سکے، پانچ کروڑ کا سونا چاندی، نو کروڑ کے قیمتی ظروف، بیس کروڑ کا فرنیچر اور دو کروڑ کے قیمتی کپڑے وغیرہ تھے، ممکن ہے کہ مورخوں کا یہ بیان مبالغہ آمیز سمجھا جائے، مگر خود خواجہ عبدالکریم نے لکھا ہے:

"آنچہ نقد و جنس و جواہر آلات و نقرہ و تخت طاؤسی بادشاہ و تخت پا و صندلی پائے مرصع بادشاہان دیگر و اسپان و افیال وغیرہ ہمراہ برد، احاطۂ شمار خدائے تعالیٰ جل شانہ بہتر می داند، اغلب کہ زیادہ بر ہشتاد کرور خواہد بود"

ان تفصیلات کے بعد نادر شاہ کی عظمت تو اس برصغیر کے لوگوں میں قائم نہیں ہو سکتی ہے وہ ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا تھا، بابر کی طرح یہاں کے تخت پر بیٹھ کر اس ملک کی تاریخ بدل دیتا تو اس کا ایک تاریخی کارنامہ ہوتا، مگر وہ آیا، اسلامی اخوت کا خیال کئے بغیر ایک مسلمان حکمران کی حکومت کی بنیاد کھوکھلی اور یہاں کے لوگوں کو تہ تیغ کر کے واپس چلا گیا، اس کے بعد اسی کی روایت پر عمل کرتے ہوئے احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو آکر بار بار لوٹا اور چلا گیا، یہ عظمت کی دلیل نہیں، نادر شاہ اس برصغیر اور خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کے لئے ایک بہت ہی بدنما داغ ہے۔

بیان واقع ۱۹۷۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے شائع ہوئی، اس کے مصحح نے اس میں اپنی تمہید

اور حواشی میں نوٹ انگریزی میں لکھے ہیں، انگریزی زبان کا کابوس اب پاکستان میں ختم ہونا چاہئے وہاں کے لوگوں کو اپنی قومی اور لسانی خودداری اور وقار کا لحاظ رکھنا ہر حال میں ضروری ہے۔

نجات الرشید ـــ یہ اکبری دور کے مشہور جید عالم ملا عبدالقادر بدایونی کی تصنیف ہے، جن کا چراغ شاہی دربار میں ابوالفضل کے سامنے تو جل نہ سکا مگر اس کے بعد وہ راسخ مسلمانوں کے ذہنوں پر برابر چھائے رہے، ابوالفضل نے جب اکبر کے دیدۂ باریک بینش کو اصطرلاب آفتاب ذات اور اس کے دل حق گزینش کو رصد خانۂ سماوات صفات ثابت کر کے اس کے دین الٰہی کی حمایت کرنی چاہی تو ملا عبدالقادر بدایونی نے اکبر کے پورے دور کو احداث بدعت قرار دیا، اور اسی لیے اس دور کی تاریخ فتنہ ہائے امت سے نکالی، ان کو دکھ رہا کہ اس دور میں اسلام کے احکام میں ایسے تغیرات کئے گئے جس کی مثال گذشتہ ہزار سال میں نہیں ملتی، اس زمانہ کے تمام کفریات اور حشویات کو مستحسنات قرار دے کر درباری خوشامد اور حق پرستی کا ثبوت دیا گیا، اسی لئے انھوں نے اپنی منتخب التواریخ میں شرع مبین اور دین متین کی پوری تائید کی، اور اس زمانہ میں ان ہی کے قول کے مطابق لوگ جن خرافات باطل اور تنظویلات لاطائل کے تذبذب میں مبتلا ہو گئے تھے ان کو دور کرنے میں قلمی جہاد کیا، وہ خود اپنی منتخب التواریخ کے خاتمہ پر لکھتے ہیں کہ سودائی قلم نے اس جہاد کے جنون کے ہر قطرہ کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کر دیا ہے۔ مگر وہ اس کو شاید کافی نہیں سمجھتے، اس لئے زیر نظر کتاب نجات الرشید لکھی، اس کے لکھنے میں طبقات اکبری کے مصنف خواجہ نظام الدین احمد نے بھی پوری اعانت کی، جو اپنی اعتدال پسندی، میانہ روی اور مذہبی راسخ العقیدگی کی وجہ سے ملا صاحب کی نظر میں گوہر بے بہا تھے۔

اس کتاب کو جناب ڈاکٹر سید معین الحق صاحب نے ایڈٹ کیا ہے جو اس وقت اپنی مورخانہ بصیرت کی وجہ سے اس برصغیر میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، اس کے شروع میں ان کا

پر مغز مقدمہ ہے، جس سے ملا صاحب کی علمی سرگرمیوں کا حال مختصر طریقے سے معلوم ہونے کے ساتھ
اس کتاب کے لکھنے کا سبب بھی معلوم ہوگا۔ یہ ٹائپ کے حروف میں چھپ کر ۵۲۸ صفحے میں ختم ہوئی ہے
اس کی سات فصلوں کی علیحدہ علیحدہ سرخیوں میں تمام شرعی احکام کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں،
جس کا اندازہ اس کتاب کے حسب ذیل کچھ عنوانات سے ہوگا، شہادت دروغ، سوگند دروغ،
شرب خمر، سود خوردن، دزدیدن مال، حقوق والدین، افترا بر خدا، ترک صلوٰۃ، ترک زکوٰۃ،
آفتاب پرستی، تعظیم کواکب، زنار بستن، تشقہ کشیدن، نکاح با کافراں بستن، کافراں را راز دار ساختن،
بدعت، تعظیم اہل بدعت، استہزاء مسلماناں، سجدہ لغیر اللہ، بہ حج رفتن مقامات عبادت،
قمار بازی، راہ زنی، خیانت در امانت، ترک امر بالمعروف، چاپلوسی، غیبت، قطع صلہ رحم، حقوق اللہ
صورت گری، تاخیر در ادائے قرض، خود را از عیب پاک دانستن، ختنہ نا کردن، آبرو تراشیدن،
حیلہ آموزی، رنجانیدن ہمسایہ، سائل را زجر کردن، پل و چاہ شکستن، کفن دزدیدن، آب زراعت
دزدیدن فرق کبیرہ و صغیرہ وغیرہ وغیرہ، شاید ہی کوئی شرعی مسئلہ اور حکم چھوٹ گیا ہو، کتاب میں
قرآن مجید اور احادیث کے حوالے جا بجا ہیں تمثیلات کے ساتھ تاریخی حکایتیں بھی بیان کی گئی ہیں،
بزرگان دین کا بھی ذکر آگیا ہے، اس طرح یہ کتاب مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تقویۃ الایمان، مولانا
اشرف علی تھانوی کے مواعظ اور موجودہ دور کی بہار شریعت اور بہشتی زیور وغیرہ کی ملی جلی قسم
کی تصنیف ہو گئی ہے، اب جبکہ فارسی کی کتابوں کے مطالعہ کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے اگر
اس کا اردو ترجمہ بھی ہو جائے، تو نہ صرف اس سے اردو میں ایک صالح لٹریچر کا اضافہ ہو جائیگا
بلکہ اس سے یہ بھی اندازہ ہو سکے گا کہ اکبری دور میں مسلمانوں کو ان کے شرعی مسائل کو کس طرح
سمجھانے کی کوشش کی گئی اور آج بھی اس کے ذریعہ سے مفید مذہبی معلومات حاصل کئے جا سکتے ہیں
یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔

فتاویٰ جہانداری: یہ سلاطین دہلی کے عہد کے مشہور مورخ مولانا ضیاء الدین برنی کی
تصنیف ہے، جس کو اس دور کے پولیٹیکل سائنس کا ایک مفید لٹریچر سمجھنا چاہئے، اس میں زیادہ تر
تو وہی باتیں ہیں جن کی تعلیمات اسلام نے دی ہیں، مگر کہیں کہیں مصنف کے ذاتی خیالات و
رجحانات نمایاں ہو گئے ہیں، جن کو انھوں نے اسلامی رنگ دینے کی کوشش کی ہے، وہ بادشاہت کو
غیر اسلامی طرز حکومت قرار دیتے ہیں، گو جواب یہ متنازعہ فیہ مسئلہ بنتا جا رہا ہے، ہمارے
رسول اکرمؐ کی تعلیمات میں حکمرانی کی تمام بنیادی باتیں موجود ہیں، مگر طرز حکومت کی کوئی واضح
ہدایت نہیں، اور ہونا بھی نہیں چاہئے، کیونکہ زمانہ، ماحول اور جغرافیہ کے لحاظ سے کوئی ایک
طرز حکومت ہر زمانہ، ہر جگہ اور ہر ماحول کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا، اس کے علاوہ ایک
پیغمبر کی حکومت میں جو شان الوہیت پیدا ہو سکتی ہے وہ ایک عام انسان کی حکومت میں ممکن نہیں
مولانا ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں:

"در نبوت کمال دین داری ست، و بادشاہی کمال دنیاست، و ہر دو کمال مخالف
و متضاد یکدیگر ست و جمع آں از ممکنات نیست" (ص ۱۴۰)

اور رسول اکرمؐ کے نمونہ کی حکومت کو ناممکن العمل بتا کر لکھتے ہیں:

"پس خلفاء و سلاطین اسلام را ضرورت شد کہ از برائے اعلائے کلمۂ حق و غلبۂ دین
و ابقائے ذات خود در رسم خسروی زنند" (ص ۱۴۱)

انھوں نے بادشاہت کو قابل انگیز طرز حکومت سمجھ کر بادشاہ کے اوصاف متعین کرنے کی کوشش کی ہے
ان کا یہ لکھنا صحیح ہے کہ بادشاہ اپنے دین میں راسخ ہو (ص ۱۰) وہ اپنے مخلصوں سے برابر مشورے
لیتا رہتا ہو (ص ۲۴) اس کے عزم میں ثبات ہو، متزلزل نہ ہو (ص ۵۰) عدل پسند ہو، ظلم،
تعدی اور غارتگری کو پسند نہ کرتا ہو (ص ۶۶) رعایا اور ارکان دولت کے ساتھ شفقت و مہربانی

اور احسان کے ساتھ پیش آتا ہو (ص ۸۱) اپنی فوج کی استقامت کا خیال رکھتا ہو (ص ۹۳) داد و ستد کے ساتھ اپنا خزانہ پُر رکھتا ہو (ص ۱۱۴) مملکت کی خبر رسانی کا پورا اہتمام رکھتا ہو تاکہ فتنہ و فساد کی بیخ کنی کرتا رہے (ص ۱۱۸) ملک کے اقتصادی نظام کو ایسا برقرار رکھتا ہو کہ ارزانی ہو اور مخلوق مطمئن ہو۔ (ص ۱۳۱) وہ اپنے اوقات کی قدر کرتا ہو (ص ۱۴۷) اپنی جہانداری میں حق کو مرکز بنائے رکھتا ہو (ص ۱۶۴) فتنہ پردازوں، چوروں، مکاروں اور غاصبوں وغیرہ کو پوری سزا دیتا ہو، مگر جہانداری کے اور معاملات میں عفو پسند ہو (ص ۱۸۳) ضوابط ملکی کی پابندی کرانے میں سخت ہو (ص ۲۱۷) عالی ہمت ہو (ص ۲۴۳) اس کے مزاج پر کسی کا استیلا نہ ہو (ص ۲۹۱) پرانے خاندانوں کی محافظت بھی کرتا ہو۔ ایک بادشاہ کے اخلاق حسنہ کا ذکر کرنے کے بعد وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس میں قبض و بسط، قہر و لطف، اعطا و امساک، اور تواضع و تکبر کی متضاد صفتوں کا جمع ہو جانا بعید نہیں (ص ۲۶۷) مگر وہ اپنے میں اوصاف رذائل پیدا نہ ہونے دے اور نہ رذیلوں سے میل جول رکھے (ص ۳۱۷) اس کی اصلی نجات اس میں ہے کہ اس کی عاقبت بخیر ہو (ص ۳۳۷)

بادشاہ کے ان اوصاف پر کسی بحث کی گنجائش نہیں، یہ ایک آئیڈیل حکمراں کی صفات ہیں، مگر مصنف جب بار بار یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایک مسلمان بادشاہ کے لئے لازم ہے کہ وہ کفر و شرک کو ختم کرے، کافروں اور مشرکوں کا قلع قمع کرے اور ان کی آبرو و عزت کو روا نہ رکھے، (ص ۱۴۲) یہ نہ اسلام کی تعلیم ہے اور نہ ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر عمل رہا، سورہ نحل۔ ۹ میں ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن وہ جس کسی پر چاہتا ہے راہ گم کر دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے کھول دیتا ہے، وہ دنیا میں کسی کے کام اور عقیدہ کی بازپرس نہیں کرتا ہے، عاقبت میں کرے گا، ہمارے رسول کفر اور شرک کا

قلع قمع کرنے کے لئے نہیں بھیجے گئے، بلکہ وہ نیکوں کو محض خوش خبری سنانے، غافلوں کو ہوشیار کرنے خدا کے حکم پر اس کی طرف پکارنے اور دنیا میں ایک روشن چراغ جلانے کے لئے مبعوث کئے گئے، (احزاب۔ ۶) آپ لوگوں پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے، اگر لوگوں نے آپ سے روگردانی کی تو اس کی ذمہ داری ان پر ہے، آپ پر نہیں، اس کے جواب دہ وہ ہوں گے، آپ نہیں ہونگے (غاشیہ ۲۲۔ ۲۶، انعام ۱۰۷، بنی اسرائیل ۵۴) اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کے پیام کو روگردانی کرنے والوں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے، ان پر کوئی زور، جبر اور زبردستی نہ کی جائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے مدینہ تشریف لائے تو یہودیوں کی شر انگیزی اور بد باطنی سے واقفیت رکھنے کے باوجود ان سے جو معاہدہ کیا، اس میں اور شرائط کے ساتھ یہ بھی تھا کہ یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی، یہود اور مسلمان آپس میں دوستانہ تعلقات رکھیں گے، (ابن ہشام ج ۱ ص ۷۹۔ ۲۷۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ کیا اس میں اس کی وضاحت تھی کہ ان کی جان، زمین، مال، عبادت، مذہب، ان کے پادری، راہب، ان کی عبادت گاہیں اور ان کے قبضہ میں جو کچھ بھی ہے، وہ اللہ کی امان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ میں ہیں، انھیں نہ کوئی نقصان پہونچایا جائے گا، نہ کسی تنگی میں مبتلا کیا جائے گا، کسی اسقف کو اس کی اسقفیت اور کسی راہب کو اس کو رہبانیت سے نہیں ہٹایا جائے گا۔ اسی پر خلفائے راشدین کا بھی عمل رہا (کتاب الخراج نواں باب) اس کے بعد مولانا ضیاء الدین برنی نے ہندؤں اور غیر مسلموں کے ساتھ جس رویہ کی تلقین کی ہے اس کو ان کی غیر ذمہ دارانہ ذاتی رائے سمجھنا چاہئے۔ انھوں نے اسی قسم کی باتیں اپنی تاریخ فیروز شاہی میں بھی لکھ دی ہیں، جن کو پڑھ کر غیر مسلموں کو نہ صرف اشتعال پیدا ہوتا ہے، بلکہ ان کے ذہن میں اسلام کا بہت ہی غلط تصور پیدا ہو جاتا ہے۔

فتاویٰ جہانداری کو ایک خاتون نے ایڈٹ کیا ہے، جنھوں نے انگریزی میں تو اپنا نام ڈاکٹر افسر سلیم خان لکھا ہے، لیکن اردو میں ڈاکٹر مسز اے۔ سلیم خان لکھا ہے، اس میں ان کا فاضلانہ مقدمہ انگریزی میں ہے اور اس کے اندر حواشی بھی انگریزی میں ہیں، انھوں نے انگریزی میں مقدمہ تو شاید اس لئے لکھا ہو کہ ان کو اردو لکھنے میں وہ قدرت نہ ہو جو ان کو انگریزی میں ہے، مگر انگریزی میں حواشی لکھنے کا کوئی عذر قابل سماعت نہیں ہو سکتا، اگر کسی مستشرق کے لئے یہ حواشی لکھے ہیں تو جو مستشرق فتاویٰ جہانداری کو پڑھ سکتا ہے وہ فارسی رسم الخط کے حواشی کو بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے، پاکستان میں یہ عام خیال ہو گیا ہے کہ وہی شخص باعزت اور وجیہہ سمجھا جا سکتا ہے جو انگریزی لباس پہنتا ہے، شاید وہاں کے وہی اہل علم بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں، جو اپنی مادری زبان میں کمزور ہوں لیکن انگریزی زبان میں پر زور ہوں،

مقدمہ میں اس کتاب کا جو ناقدانہ تجزیہ کیا گیا ہے، وہ تنقیدی جائزہ کا بہت اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے، اب تک بادشاہوں کے جنگی اور ملکی کارناموں ہی پر تبصرہ ہوتا رہا ہے، مگر طرز حکومت پر نظری و فکری جائزہ بہت کم لیا گیا ہے، اس سلسلہ میں اس مقدمہ کی تحریر ایک بہت ہی سودمند اضافہ ہے، امید کہ اسی قسم کی تحریریں اور بھی لکھی جاتی رہیں گی

ڈاکٹر افسر سلیم خاں نے فتاویٰ جہانداری کی تعریف شاید ضرورت سے زیادہ یہ لکھ کر کی ہے، کہ یہ کتاب غزالی کی نصیحت الملوک، نظام الملک طوسی کی سیاست نامہ، ابن طقطقی کی تاریخ فخری اور کیکاؤس کی قابوس نامہ کے انداز کی ہے (ص ۵۵) اسی کے ساتھ انھوں نے اس کو نکولو میکاولی کی پرنس سے بھی مشابہت دیدی ہے، (ص ۵) مگر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ضیاء الدین برنی کے سامنے ایک دیندار بادشاہ کا تخیل تھا، پھر ان کی کتاب میکاولی کی پرنس کی صف میں کیسے شامل کی جا سکتی ہے، جس میں صرف عیاری، مکاری اور فریب دہی کی تعلیم دی گئی ہے، مقدمہ کی قابل قدر تحریریں

انگریزوں کی تصانیف کے حوالے جا بجا ہیں، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور اعنائڈ جیسے ثانوی حوالے کو دیکھ کر تعجب ہوا جو باتیں ان سے لی گئی ہیں وہ عربی اور فارسی کی مستند کتابوں سے لی جا سکتی تھیں، احیاء العلوم سے کئی باتیں یوروپین مصنف کے سہارے لکھی گئی ہیں، (ص ۸۰) اور جو بات زیادہ کھٹکی وہ یہ کہ کلام پاک کی آیتیں بھی انگریزی کتابوں کے حوالے سے درج کی گئی ہیں (ص ۹۲) ان باتوں سے قطع نظر مقدمہ میں جو اظہار خیال کیا گیا ہے اس میں توازن اور اعتدال پسندی ہے، یہ کتاب بھی ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب لاہور سے ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی،

تاریخ گنج پورہ۔ کنج پورہ کرنال ضلع کی ایک ریاست تھی، جس کو یوسف زئی کے ذکا خیل کے ایک پٹھان نجابت خاں نے ۱۷۲۴ء میں قائم کیا، ۱۱۵ صفحے کی اس کتاب میں اس ریاست کی تاریخ ۱۲۲۳ھ تک کی ہے، اس میں نجابت خاں کی تصویر اچھی نہیں ابھرتی ہے، کیونکہ اس نے اپنی جاگیر کو محفوظ رکھنے کی خاطر نادر شاہ سے ساز باز کی، اسی طرح اس کے جانشینوں نے احمد شاہ درانی، مرہٹوں، سکھوں اور انگریزوں کا ساتھ دے کر دہلی کے مغل فرمانرواؤں کو نظر انداز کیا، اس کتاب کا مولف کوئی غیر معروف شخص اثر نیاز ہے، جسکو فارسی زبان لکھنے میں زیادہ مہارت نہیں، لیکن اس ریاست کی تاریخ جاننے کے لئے یہ کتاب مفید ہے اس کو ایڈٹ جناب ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے کیا ہے، باقر صاحب کے نام کے آگے پیچھے کچھ نہیں لکھا ہے، خیال ہوتا ہے کہ یہ باقر صاحب لاہور کے مشہور اہل قلم اور مصنف ڈاکٹر محمد باقر سے مختلف ہیں، اس میں بھی [illegible] اور حاشیے انگریزی میں ہیں، یہ کتاب ۱۹۷۳ء میں طبع ہوئی، عام خیال ہے کہ لیتھو کی چھپائی میں طباعت کی بہت سی غلطیاں ہونا ناگزیر ہے یہ ۱۱۵ صفحے کی کتاب ٹائپ حروف میں چھپی ہے، لیکن اس میں چار صفحے کا تصحیح نامہ منسلک کیا گیا ہے،

فہرست مخطوطات شیرانی۔ اس کی تین جلدیں ہیں، جن میں اس برصغیر کے مشہور عالم پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی کے جمع کردہ ساڑھے تین ہزار مخطوطات کا اجمالی تعارف ہے، ان میں ڈھائی ہزار

فارسی اور بقیہ دوسری زبانوں میں ہیں، پروفیسر شیرانی مرحوم کی یہ قیمتی دولت پنجاب یونیورسٹی نے ان کی رحلت سے پہلے خرید لی تھی، اس کی فہرست کی تینوں جلدیں جناب ڈاکٹر محمد بشیر حسین نے تیار کی ہیں جو ادارہ تحقیقات پاکستان میں ریسرچ افیسر تھے، پھر اورنٹیل کالج لاہور میں لکچرار ہو گئے پاکستان میں کیٹلاگ تیار کرنے کا آرٹ برابر فروغ پا رہا ہے، اور وہاں اس کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے، یہ تین جلدیں بھی اسی اہمیت کے پیش نظر تیار ہوئیں، اس کی پہلی جلد میں تاریخ ہند کی فہرست پر نظر دوڑائی، عنوان تاریخ ہند میں عہد کی تقسیم کئے بغیر ساری کتابیں درج کر دی گئی ہیں، اگر سلاطین دہلی، شاہان مغلیہ اور متفرق ریاستوں کی تاریخوں کا ذکر عہد کے اعتبار سے ہوتا تو اس سے زیادہ خوش سلیقگی کا اظہار ہوتا، ان فہرستوں کو دیکھ کر پروفیسر محمود شیرانی کی قدروں میں اس حیثیت سے زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ انھوں نے ان نسخوں کے جمع کرنے میں کیا کیا پریشانیاں نہ اٹھائی ہونگی، فہرست نگار کا بیان ہے کہ دنیا بھر میں بعض مخطوطات کے واحد نسخے صرف اسی مجموعہ میں ہیں، بعض نسخے مؤلفین کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں اسی میں قرآن مجید کی ایک تفسیر بھی ہے جو فردوسی (متوفی ۴۱۱ھ) کے زمانہ میں لکھی گئی، واجد علی شاہ نے ۱۲۶۵ھ میں اپنی تصنیف عشق نامہ جو اپنے ہاتھ سے لکھی تھی وہ بھی اس میں موجود ہے،

ہم ڈاکٹر محمد جہانگیر خاں ڈائرکٹر ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب لاہور کے ممنون ہیں کہ انھوں نے یہ گرانقدر مطبوعات دیکر ہم کو نوازا، اب اس ادارہ کو دار المصنفین کی طرف سے یہ پیام ہے کہ تاریخ ہند کے سلسلہ میں انگریزوں کے زمانہ میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے جتنی کتابیں شائع ہوئی تھیں وہ اب کہیں سے بھی نہیں خریدی جا سکتی ہیں، جن کتب خانوں میں یہ ہیں ان کے اوراق اتنے خستہ اور بوسیدہ ہو چکے ہیں کہ ان کا پڑھنا بہت مشکل ہے، اگر ادارہ تحقیقات پاکستان دانشگاہ پنجاب لاہور ان کتابوں کے نئے اڈیشن شائع کرنا شروع کر دے تو یہ اس کے مزید بڑے علمی احسانات ہونگے، امید کہ یہ آواز دہاں سنی جائیگی،

(باقی)

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مکاتیب علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

بنام

شیخ نذیر حسین مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام پنجاب یونیورسٹی لاہور

بھوپال

مکرم :- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حج کی مبارکباد کا شکریہ، آپکے حالات سُن کر خوشی ہوئی.

سلیس عبارت کی حسب ذیل کتب سوانح و تواریخ کا مطالعہ فرمائیں،

سیرۃ ابن ہشام، مقدمہ تاریخ ابن خلدون، کتاب البیان والتبیین للجاحظ، عام مطالعہ کے لئے تاریخ ابن خلدون، تاریخ ابوالفداء، حدیث میں مشکوٰۃ شروع کیجئے، المثل السائر، کتب معانی وادب میں سے ہے، اس میں قرآن پاک کی آیات کی فصاحت و بلاغت کے تذکرے جا بجا آئے ہیں، کتاب کا نام المثل السائر ہے، اسی نام سے عربی کتب فروشوں کی دوکانوں پر ملے گی، الحمد للہ تعالیٰ اب بخیر ہوں،

والسلام سید سلیمان ندوی

۲۸ جنوری ۱۹۵۰ء

بھوپال

مکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

جواب دیر سے جا رہا ہے، قلب میں انشراح نہ تھا، آج جواب کی نوبت آئی،

(۱) نہج البلاغہ آپ پڑھ سکتے ہیں، اس کے اردو ترجمے کا حال مجھے معلوم نہیں، (۲) جاحظ کی کتاب المحاسن والاضداد ادب کے لئے مفید ہے، اس میں مختلف موضوعات پر خیالات ظاہر کئے گئے ہیں، اور اچھے اور برے دونوں نتائج دکھائے گئے ہیں، عبارت سادہ اور انشا پردازانہ ہے پر تکلف نہیں ہے، طبقات ابن سعد کی عبارت بھی پر تکلف نہیں ہے (۳) دلائل الاعجاز میں اصول فصاحت وبلاغت کے مسائل میں ضمناً کہیں کہیں قرآن پاک کے اعجاز پر بھی بحث آگئی ہے، آپ کافیہ پڑھ چکے ہیں، تو پھر کسی کتاب کی کیا ضرورت ہے، یہ کتاب بہرحال اچھی ہوئی ہے، اور مشکل ہے، آج کل النحو الواضح ایک کتاب مصر میں لکھی گئی ہے، اور مدارس میں رائج ہے،

حریری اور متنبی تو ادب عربی کو برباد کر دیتی ہیں، اس قسم کی کتابوں کو کبھی نہ پڑھیں کہ ان سے مذاق فاسد ہوگا، آپ حسب ذیل کتابیں پڑھیں،

۱۔ مقدمہ ابن خلدون، (۲) دلائل الاعجاز جرجانی (۳) اسرار البلاغۃ جرجانی (۴) کتاب البیان والتبیین جاحظ، (۵) نقد الشعر قدامہ، (۶) کتاب الصناعتین، ابو ہلال عسکری،

والسلام سید سلیمان ندوی،

۲۴ مارچ ۵۰ء

بھوپال

مکرم:- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

خط ملا۔ مقدمہ ابن خلدون بار بار دیکھیں، اور سمجھ کر دیکھیں، سوانح مشاہیر اسلام کیلئے

تاریخ ابن خلکان دیکھیں، نہایت عمدہ کتاب ہے، اور زبان وادب کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے، ابن اثیر، واقعات کی کھتونی ہے، اس میں زبان کی حلاوت اور ادب کا نمک نہیں، عربی اشعار کے ایسے مجموعے جن میں ہر دور کا کلام ہو، آج کل متعدد لکھے گئے ہیں، اور کتب فروشوں کے پاس ملتے ہیں، مگر جوبات ابو تمام کے حماسہ کی ہے وہ کسی میں نہیں، گو یہ صرف جاہلیین اور اسلامیین کے کلاموں کا مجموعہ ہے،

حجاز کے موجودہ سفر کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا، اس لئے کوئی تحریر بھی شائع نہ ہو سکی،

والسلام سید سلیمان ندوی ۱۱ اپریل ۱۹۵۰ء

حیات سلیمان

یہ محض جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ اُن کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے، جس میں سید صاحب کے دور کے جو نصف صدی سے زیادہ تک محیط تھا، تمام ملی و قومی و سیاسی، علمی وادبی و لسانی تحریکوں مثلاً ہنگامہ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، تحریک جنگ آزادی، مسئلہ ملوکیت حجاز، انہدام مقابر و مآثر حجاز وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے، اسی کے ساتھ دار المصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، اور سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ترک قیام دار المصنفین، سفر بھوپال، ہجرت پاکستان، اور پھر بھوپال، اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں، نیز مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے پہلے سفر یورپ پھر سفر حجاز، پھر سفر افغانستان وغیرہ کی بہت مفصل روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہو گئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز انشاء کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا ثمنی ہے، ویسی ہی دلکش، اور دلچسپ، مؤلفہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، قیمت ۲۷ روپیہ، ۵۰ پیسے،

"منیجر"

ادبیات

عطائے خاص

از

جناب ڈاکٹر محمد نثار احمد خان نثار صدر شعبۂ اردو ناگپور یونیورسٹی ناگپور

روح پرور خلشِ سوزِ محبت دے دی / مجھ کو اللہ نے کیا خوب یہ دولت دیدی

اس سے بڑھ کر کوئی احسان نہیں ہو سکتا / ایک غم دے کے جہاں بھر کی مسرت دیدی

بخش کر اک دلِ آزردہ و آلام پسند / سیکڑوں نعمتوں کی ایک ہی نعمت دیدی

شکر ہے اس کا عطا کر کے فقیرانہ مزاج / نگہِ ہر دو جہاں میں مجھے عزت دیدی

حسن صورت کا تو کن ہی نہیں ہے لیکن / ناز اس پر ہے کہ انسان کی سیرت دیدی

غمِ انساں میں مرے دل کو تڑپ جانے کی / خاص توفیق باندازۂ ہمت دیدی

از رہِ لطف و کرم دے کے قلم کی دولت / مجھ کو اربابِ زر و سیم پہ سبقت دیدی

جو لگا لیتی ہے ہر شے کی حقیقت کا سراغ / اس کی رحمت نے مجھے ایسی بصیرت دیدی

نثار کہہ کر اسے آئینۂ عکسِ دوراں

تم نے مضمونِ غزل کو بڑی وسعت دیدی

باب التقریظ والانتقاد

دی ریلیجن آف اسلام مرتبہ سید قطب

از

ڈاکٹر انور شبنم دل یونائٹڈ اسٹیٹس انٹرنیشنل یونیورسٹی سین ڈیگو کیلیفورنیا

"پروفیسر ڈاکٹر انور شبنم دل بڑے راسخ اور اہل دل مسلمان ہیں، سید قطب کی کتاب پر ان کی یہ تقریظ انگریزی میں تھی جس کا آزاد اردو ترجمہ مولوی عمیر الصدیق ندوی نے کیا ہے، امید کہ معارف کے ناظرین اسکو پڑھ کر محظوظ ہوں گے۔" (معارف)

جناب سید قطب نے عربی میں ایک کتاب 'ھذا الدین' لکھی تھی جس کا انگریزی ترجمہ اسلام دوست نے دی ریلیجن آف اسلام کے نام سے کیا ہے یہ کیلیفورنیا کے المنار پریس میں چھپا ہے، اس کی ضخامت [illegible] صفحے ہے،

اس دور کے ایک ممتاز مفکر کی لکھی ہوئی اس چھوٹی سی کتاب سے اس دور میں اسلام کی اہمیت کے ساتھ اس کا بھی اندازہ ہوگا کہ دنیا کے موجودہ حالات میں اسلام کی تجدید کے لیے حالات کس قدر ساز گار اور امید افزا ہیں، اس میں سات چھوٹے چھوٹے ابواب ہیں، چار صفحے میں وہ عربی اصطلاحات و اسماء درج کر دیئے گئے ہیں، جن کا استعمال کتاب میں ہوا ہے، اس کے مترجم، طابع اور ناشر ہماری داد کے مستحق ہیں کہ ان کی وجہ سے ایسی دل آویز کتاب ہمارے ہاتھوں میں پہونچ گئی ہے،

سید قطب (۱۹۰۶ء - ۱۹۶۶ء) اس کا آغاز یہ لکھکر فرماتے ہیں کہ اسلام کی جو کار فرمائی انسانی زندگی میں ہے، اس کا یہ بنیادی نکتہ اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، کہ اسلام حیات انسانی کے لیے خدا کی ایک مقررہ شاہراہ ہے، یہ انسان کی اس جد وجہد سے طے ہو سکتی ہے جو انسانی صلاحیتوں اور اس کے ماحول کے مادی وسائل کے اندر ہوتی ہے، (ص ۲) اسلام کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ انسان کی محدود طاقت کو نظر انداز نہیں کرتا ہے، ترقی کے مختلف مدارج میں انسانی کوائف کے مادی تقاضے سے بھی غفلت نہیں برتتا ہے پھر ایک مسلمان کو اس پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ ضروری کوشش کرے تو انسان کے بنائے ہوئے نظام کے مقابلہ میں اللہ کی مقررہ شاہراہ پر چل کر نسبتاً زیادہ آرام اور اعتدال کے ساتھ انسانی ترقی کی بلند تر منزل تک پہنچ سکتا ہے،

سید قطب ان لوگوں کے شبہات کو خاص طور سے دور کر دیتے ہیں، جو اسلام کی فطرت اور اس کی کار فرمائی سے واقفیت نہیں رکھتے ہیں، اور غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اس سے معجزانہ کارنامے کی توقع رکھتے ہیں، قرآن مجید میں اس کی تصریح ہے کہ خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت بدلنے کی خواہش نہیں کرتی، اسی طرح جو خدا کی راہ کو تلاش کرتے ہیں اسی کو خدا راہ دکھاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے لئے ایک راہ مقرر کر دی ہے، جو انسانی کوشش سے طے ہو سکتی ہے، اور اس میں اللہ تعالیٰ کی رہنمائی اور رحمت شامل حال ہو جاتی ہے، قرآن مجید کی تعلیمات کا مقصد یہ ہے کہ افراد اور سوسائٹی کی زیادہ سے زیادہ فلاح کے لیے باہمی مفاہمت کا ماحول پیدا ہوتا رہے، اسلام اور مسلمان کے عروج و زوال کی تاریخ اس بات کی شہادت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ

راہ کو طے کرنا انسانی کوششوں پر چھوڑ دیا گیا ہے، سید قطب ایک اہم بات کی طرف یہ لکھکر توجہ دلاتے ہیں کہ مذہب کی صداقت اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ لوگ خود اس کے لئے کوشاں نہوں وہ اس کی صداقت کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہوں، یا پس وپیش کرتے ہوں تو وہ اپنی عدم آمادگی اور پس وپیش کی کیفیت کے خلاف اس طرح جد وجہد کریں کہ وہ اسلام اور اس کی حقانیت تک پہونچ سکیں، (ص ۹) اگر صحیح راستہ کی جد وجہد میں جوش اور لگن ہو تو ایک فرد کو بلند تر افق دکھائی دیتا ہے، پھر اس کی پوری شخصیت انسانیت کی فلاح کے لیے ایک متحرک قوت بن جاتی ہے، انسانی جد وجہد سے اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ راہ کو طے کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کی توفیق اور رہنمائی سے بے نیاز ہو جائے، سید قطب بجا طور سے اسپر زور دیتے ہیں، کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی توفیق اور رہنمائی کے حقایق انسان کے ذہن میں پوری قوت کے ساتھ قائم نہیں ہوں گے اسکا دین مکمل نہیں کہا جائے گا،

اسلام کا اصلی عقیدہ یہ ہے کہ ہم دین کو قبول کرتے ہوئے اس کی شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے رسول ہیں، یعنی اللہ اور صرف اللہ ہی الوہیت کا مالک ہے، اور اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ انسان کے لئے ایک راہ مقرر کرے، جس پر انسان کو چلنا ضروری ہے، انسان کو یہ راہ دکھانے والے ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اگر ہم اس عقیدہ کے ہو جائیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو راہ قرآن اور سنت کے ذریعہ سے بتائی گئی ہے، وہی اصلی راہ ہے تو ہم اسی کے مطابق ایک مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے پر مجبور رہیں،

سید قطب نے یہ کہہ کر مزید وضاحت کی ہے کہ اگر انسانی زندگی اور تخلیق کے مقصد میں ہم آہنگی نہیں ہوتی تو پھر بڑا پریشان کن تصادم پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کا اندازہ مغربی دنیا کی موجودہ صورت حال سے کیا جا سکتا ہے، جہاں بے مثال مادی خوشحالی اور سائنس کے علوم کی ترقی کے باوجود انسانی زندگی اور انسانی معاملات میں بڑا بحران ہے۔

اس کے بعد سید قطب اسلام کے خلاف دو بڑے الزامات کی تردید کرتے ہیں، یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کے عروج کا زمانہ بہت مختصر ہے۔ اسلام ایک زندہ فعال قوت کی حیثیت سے باقی نہیں رہا، یہ خیال صحیح نہیں کہ اسلام کا زوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ہی شروع ہو گیا، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ ضرور شہید ہوئے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں اختلافات بھی پیدا ہوئے، ایسے واقعات بھی رونما ہوئے جن سے انتشار پیدا ہوا، مگر ان تمام باتوں کو اسلام کے دشمن اس رنگ آمیزی سے پیش کرتے ہیں کہ بہت سے خوش عقیدہ مسلمانوں میں بھی کم و بیش یہ شک پیدا ہونے لگتا ہے کہ اسلام ایک متحرک قوت اور ابدی آئیڈیالوجی نہیں ہے، "مسلمان عوام اپنی صحیح تاریخ سے واقف نہیں ہیں، جس سے ان کے اس شک میں اضافہ ہو جاتا ہے، لیکن گذشتہ دس صدیوں میں مسلمانوں نے انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں جو کارنامے انجام دے ہیں، ان کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی سطوت کا زمانہ ایسا مختصر تھا کہ اس کو ایک اتفاقی حادثہ یا ایک ایسی کرامت کہی جائے جو پھر کبھی ظہور پذیر نہیں ہو سکتی، تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ سب کچھ ایک پرجوش انسانی جدوجہد کی بدولت عمل میں آیا، اسلام کے دور عروج میں بہت سی بلند ترین شخصیتیں پیدا ہوئیں جو انسانیت کے ایسے نمونے تھے کہ انسانی تاریخ کے کسی دور کی بھی شخصیتیں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہیں، یہ مرد اور خواتین اس بات کا ثبوت ہیں کہ انسان اپنی صلاحیتوں کے اندر رہ کر اپنی

کوششوں سے نیکی کی راہ میں کیا کچھ حاصل نہیں کر سکتا ہے، اسلام کی یہ عظیم نسل عرب کے فلاکت زدہ صحرا میں پیدا ہوئی، تاریخ بتاتی ہے، کہ اس کو کن کن مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا، ایسے مسلمان دنیا کے مختلف حصوں میں دس صدیوں تک پھیلے رہے، جنھوں نے انسانی ترقی کے لئے نمایاں کام انجام دیئے، اسلام کی تعلیمات سے اب بھی ایسے مسلمان پیدا ہو سکتے ہیں، اگر پیدا ہونے کی کوشش کی جائے اس کا راز اس میں پوشیدہ ہے کہ انسان کی فطرت سے پورا تعاون کر کے اس کی پوری قوت کو بروئے کار لایا جائے، (ص ۴۳)

اسلام کے خلاف دوسرا الزام یہ ہے کہ اس کا اخلاقی نظام بہت ہی سخت اور غیر لچک دار ہے، یہ صحیح ہے کہ خدا کی مکمل اطاعت اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے، کیونکہ اسی سے انسان کے اندر نیک اور تعمیری کام کرنے کی قوتیں بیدار ہوتی ہیں، اور وہ ان منفی طاقتوں کو قابو میں رکھ سکتا ہے، جو اس کی راہ میں حارج ہوتی ہیں، اسلام کے عروج کا جو زمانہ ہے وہ منفی صورت حال کے خلاف مسلمانوں کی عظیم ترین اور مشکل ترین جدوجہد کا بھی زمانہ ہے وہ منفی حالات کو قابو میں لا کر مثبت حالات میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہوئے،

انسانی ترقی میں اسلام کے جو اثرات ہیں اس کا اعتراف انسانیت کے مؤرخوں نے کیا ہے، سید قطب اس نتیجے پر پہونچے ہیں،

"یورپ میں لوتھر اور کیلوین نے مذہب میں اصلاحات کیں، یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا اور اب بھی جاری ہے، جاگیر دارانہ نظام کا خاتمہ ہوا استبداد سے نجات حاصل ہوئی، انگلستان میں میگنا کارٹا اور فرانس میں وہاں کے انقلاب سے انسانی مساوات اور حقوق کی تحریکوں کی ابتدا ہوئی، تجرباتی طریقے ایسے

اختیار کئے گئے جن سے سائنس میں پر شکوہ ترقی ہوئی، تاریخ کو ان ساری ترقیوں

پر ناز ہے، لیکن یہ سب اسلام کی لہر سے بنیادی طور پر متاثر ہوئیں "

ہم کو اچھی طرح احساس ہو گیا ہے کہ ہم اسلام کی راہ پر چل کر کہاں پہونچ سکتے ہیں، اور اس راہ کو چھوڑ کر کس سمت میں بھٹک سکتے ہیں، سید قطب نے اس بات کا احساس دلایا ہے کہ جب ہم کو یہ حقیقت معلوم ہو چکی ہے تو دنیا کے لئے اسلام کی راہ پر چلنے کی فضا سازگار ہو گئی ہے،

جزیرۃ العرب میں اسلام کے خلاف جو حالات پیدا ہو گئے تھے وہ اسلام کے لئے ایک چیلنج تھا، ایک بات جو عمل میں آ چکی ہے وہ پھر عمل میں لائی جا سکتی ہے، جو کچھ عمل میں آیا تھا وہ کوئی معجزہ نہ تھا بلکہ یہ سب کچھ اس لئے عمل میں آیا کہ انسانی فطرت کی تمام عظیم قوتوں کو استعمال میں لایا گیا، وہ عظیم قوتیں پھر میسر ہو جائیں، اور اب تو یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا ہے کہ اسلام کے بڑھنے والے اثرات کا بھی تجربہ ہو چکا ہے، موجودہ دنیا مذہب سے دور ہوتی جا رہی ہے، جس سے لوگوں کو خدا کی طرف مائل کرنے میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے اس چیلنج کے منفی پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتے، لیکن ہم کو قرآن کے ان الفاظ کو غور سے پڑھنا چاہئے،

ولا تھنوا ولا تحزنوا — اور بے دل نہ ہو اور نہ کسی

وانتم الاعلون ان — طرح کا غم کرو اگر مومن ہو تو

کنتم مومنین (آل عمران رکوع ۱۴) — تم ہی غالب رہو گے،

اسلام کا سیاسی نظام

اس میں اسلام کے طرز حکومت کی خوبیاں اور دوسری حکومتوں کے مقابلہ میں اسکی برتری دکھائی گئی ہے، مولفہ۔ مولانا محمد اسحاق سندیلوی، قیمت:۔ ۴ - ۹

منیجر

مطبوعات جدیدہ

شرق اوسط کی ڈائری ۔ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ترجمہ مولوی شمس الحق ندوی متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۴۶۰ مجلد مع خوبصورت گرد پوش قیمت ۱۵ روپئے، پتہ ۔ مکتبہ فردوس مکارم نگر لکھنؤ،

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو اصلاح و تبلیغ کے کام سے طبعی مناسبت اور خاص دلچسپی ہے، اس کے لئے وہ ہندوستان کے گوشے گوشے کے علاوہ کئی عرب ملکوں اور یورپ و امریکہ کا بھی سفر کر چکے ہیں، پہلی مرتبہ وہ ۱۹۵۱ء میں شرق اوسط تشریف لے گئے تھے، جس کا روزنامچہ ۱۹۵۴ء میں "مذکرات سائح فی الشرق العربی" کے نام سے شائع ہوا تھا مگر ابھی تک اس کا اردو ترجمہ نہیں چھپا تھا، حالانکہ مولانا کی عربی کتابوں کے اردو اور اردو کے عربی ترجمے فوراً ہی شائع ہو جاتے ہیں، زیر نظر کتاب اسی ڈائری کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ ہے، وہ تقریباً آٹھ مہینے مصر، شام اور سوڈان میں قیام پذیر رہے اور اس عرصہ میں وہ وہاں کے دیہاتوں، قصبوں اور شہروں میں گئے، علمی، ادبی دینی، اور تبلیغی اجتماعات اور کانفرنسوں میں شریک ہوئے، کتب خانوں، مدرسوں، یونیورسٹیوں اور آثار قدیمہ کی سیر کی، علمی، تعلیمی، دینی و اجتماعی حالات کا مشاہدہ کیا، قومی، ملی، مذہبی اور سیاسی تحریکوں کا مطالعہ کیا، مختلف اصحاب علم و ادب سے ملاقات کی اور ان سے علمی و تعلیمی موضوعات اور اصلاحی و دینی مسائل پر تبادلہ خیالات کیا، یہ ڈائری ان ہی مشاہدات و تاثرات پر مشتمل ہے، مولانا نے مصری علما کو ہندوستان کے عام حالات خصوصاً یہاں کی علمی و مذہبی سرگرمیوں اور دعوتی

و اصلاحی تحریکوں سے واقف بھی کرایا ہے، اور ان کے سامنے اپنے دعوتی تجربات بھی رکھے ہیں اور ان کے تجربوں اور مشوروں سے فائدہ بھی اٹھایا ہے، مگر جس خیال سے ان کو اختلاف ہوا اس کو کسی لاگ لپیٹ کے بغیر ظاہر کر دیا ہے، اس اعتبار سے یہ ڈائری ایک دستاویز ہے، اس سے عرب ملکوں کے علمی، ادبی اور اجتماعی حالات اور وہاں کے مختلف مدارس فکر و مکاتب خیال کے مصنفین اور رہنماؤں کے بارہ میں مفید اور دلچسپ معلومات حاصل ہوتے ہیں، نیز خود مصنف، کے دینی احساسات، دعوت و تبلیغ سے شغف اور اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لئے ان کی تڑپ کا اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے ۱۹۵۶ء میں لبنان کا سفر کیا تھا، آخر میں وہاں کے سہ روزہ قیام کے تاثرات و مشاہدات بھی شامل کر دیئے گئے ہیں،

تذکرہ اشارات بینش (فارسی): مرتبہ سید مرتضیٰ بینش، ترتیب و تحشیہ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، تقطیع متوسط کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۰، مجلد مع گرد پوش قیمت ۸ روپئے ناشر انڈو پرشین سوسائٹی ۸۳۸، ایشخ چاند اسٹریٹ لال کنواں دہلی ۶

سید مرتضیٰ بینش گذشتہ انیسویں صدی میں کرناٹک (دکن) کے صاحب کمال شاعر و ادیب تھے، "اشارات بینش" ان کی قلمی یادگار ہے، یہ جنوبی ہند کے اکثر فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے، جو گذشتہ صدی میں مدراس سے چھپا تھا، مگر اب بالکل نایاب تھا، حسن اتفاق سے اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں موجود تھا اسکی مدد سے دلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر شریف حسین قاسمی نے اس کو دوبارہ شائع کیا ہے، اس پر لائق مرتب کا مفید مقدمہ اور حواشی و تعلیقات بھی شامل ہیں، اس میں جن شعراء کا تذکرہ ہے، ان کے ذکر سے عموماً شمالی ہند کے تذکرے خالی ہیں، اس حیثیت سے یہ اہم ہے، مصنف نے ہر شاعر کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں اور ان کے کلام کے نمونے بھی دیئے ہیں، مقدمہ میں انیسویں صدی کے سیاسی و ادبی حالات، مصنف کے سوانح اور اس تذکرہ کی اہم خصوصیات کا ذکر ہے، اور تعلیقات در اصل متن پر اضافہ ہیں، ان میں ہر شاعر کے مزید حالات دوسرے ماخذوں کی مدد سے لکھے گئے ہیں، حواشی میں ہجری سنین کی عیسوی سنین سے مطابقت، عربی فقروں کے ترجے اور بعض دوسرے مصادر کی نشاندہی کی گئی ہے، یہ تذکرہ محنت و کاوش سے مرتب کیا گیا ہے، اور اس سے علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کو مدد ملے گی لیکن کہیں کہیں غلطیاں رہ گئی ہیں جو غالباً کتابت و طباعت کا نتیجہ ہیں، آخر میں اسماء و اعلام کا اشاریہ بھی دیا گیا ہے،

گوپال متل - مرتبہ۔ جناب محمد عبد الحکیم صاحب تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۴۰ مجلد مع گرد پوش قیمت پندرہ روپے، ناشر نازش بک سنٹر ترکمان گیٹ دہلی،

جناب گوپال متل اردو کے ایک اچھے صحافی، ادیب اور شاعر ہیں، اس کتاب میں ان کی خدمات ادب کا جائزہ لیا گیا ہے، یہ در اصل مرتب کا وہ مقالہ ہے جو انھوں نے ایم اے فائنل کے لئے تحریر کیا تھا اور اب اس کو کچھ اضافے کے ساتھ شائع کیا ہے، یہ چھ ابواب پر مشتمل ہے، شروع کے چار ابواب میں متل صاحب کے حالات زندگی اور صحافی، ادیب و شاعر کی حیثیت سے ان کی خدمات بیان کی گئی ہیں، پانچویں باب میں اردو ادب میں ان کا درجہ بتایا گیا ہے اور چھٹے باب میں ان کے کلام اور تحریروں کا انتخاب دیا گیا ہے، آخر میں متل صاحب کی طبعزاد کتابوں اور ترجموں کی فہرست درج ہے، یہ کتاب ایم اے فائنل کا ایک مقالہ ہے اس حیثیت سے اس کا معیار اچھا ہے لیکن اس میں متل صاحب کے حالات بہت اختصار سے لکھے گئے ہیں کہیں کہیں تکرار و مبالغہ سے بھی کام لیا گیا ہے، کو رکسر کے باوجود یہ طالب علمانہ کوشش حوصلہ افزائی کی مستحق ہے اور اس سے متل صاحب کے آئندہ سوانح نگار کو بڑی مدد ملے گی، شروع میں محمود سعیدی نے گوپال متل کی شخصیت کے خط و خال بہت خوبی سے دکھائے ہیں،

نور الایمان: مرتبہ مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی مترجمہ مولوی افتخار احمد قادری تقطیع متوسط کاغذ معمولی کتابت وطباعت بہتر صفحات ۴۰ قیمت سات روپئے ناشر اسلامی اکیڈمی، مبارکپور اعظم گڈھ، یوپی۔

مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی متبحر علما و مصنفین میں تھے، "نور الایمان بزیارۃ آثار الرحمن" ان کی مشہور تصنیف ہے، یہ اس کا اردو ترجمہ ہے، اس میں مدینہ طیبہ، روضۂ مبارکہ اور قبور کی زیارت کے دلائل و آداب تحریر کئے گئے ہیں، ان امور کے نفس جواز میں کوئی اختلاف نہیں البتہ ان کے لئے "شد رحال" یا ان کو فرض اور عظیم عبادت سمجھنے میں اختلاف ہے اور یہ صرف ابن تیمیہؒ ہی کا مسلک نہیں ہے بلکہ بعض دوسرے اسلاف سے بھی منقول ہے جیسا کہ خود تقریظ نگار نے بھی اعتراف کیا ہے، (ص ۹) مصنف نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے، اور اس ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض آثار مقدسہ جنت البقیع، مساجد اور کنوؤں کا ذکر کرکے ان کے مقدس و متبرک ہونے کو ثابت کیا ہے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استعانت کو جائز قرار دیا ہے اور اس کو شفاعت سے خلط ملط کر دیا ہے، اور اسی طرح مُردوں کے تصرف کو بھی ثابت کیا ہے، یہ اور اس طرح کی بعض دوسری رائیں دوسرے لوگوں کے نزدیک صحیح نہیں ہیں، تقریظ نگار اور مترجم کی تحریروں میں مناظرانہ رنگ غالب ہوگیا ہے، مترجم نے بعض مسائل میں مولانا کی رایوں سے اختلاف کیا ہے، جیسے مولانا کے نزدیک قبروں پر پردے ڈالنا مکروہ ہے اور جب میت گل کر مٹی ہو جائے تو قبر پر کھیتی کرنا عمارت بنانا اور اس کے اوپر چلنا جائز ہے (ص ۵۷) قبر پر زینت کے لئے عمارت بنانا حرام ہے اور بعد دفن قبر کا مستحکم کرنا مکروہ ہے (ص ۵، ۵۰) وغیرہ، لیکن مترجم کو ان باتوں سے کلی اتفاق نہیں، مولانا نے سنن ابو داؤد کے حوالہ سے لکھا ہے کہ قبر کے پاس جانور ذبح کرنا اسلام میں نہیں ہے، محشی کے نزدیک اگر یہ نام آوری اور اشتہار کے بجائے ایصال ثواب کے لئے ہو تو جائز ہے، اس طرح تو جس حکم کو چاہے جائز و ناجائز ثابت کیا جا سکتا ہے۔

"ض"

جلد ۱۲۲ ماہ جمادی الاخریٰ ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۸ء عدد ۶

مضامین